محمود، فاروق، فرزانہ
اور انسپکٹر جمشید کے کارنامے

کان کا راز

اشتیاق احمد

بار اوّل ——— جنوری ۸۰ء
تعداد ——— ۲ ہزار
قیمت ——— [illegible] پیسے
طابع ——— الجدہ پرنٹرز لاہور

مکتبہ اشتیاق
۲- شیخ سٹریٹ ۶۸/۷ اسلام پورہ (کرشن نگر) لاہور

دو باتیں

یہ "کان کا راز" ہے، اس لیے کان میں ہی کہا جا سکتا ہے، یوں تو بات کانوں کان بھی دُور جا پہنچتی ہے اور دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، آپ سوچیں گے، کہیں آج میں نے کان کھانے کا پروگرام تو نہیں بنا ڈالا، جی نہیں۔ اگر دو باتیں سن سن کر آپ کے کان پک گئے ہیں تو میں آئندہ ایک بات کر لیا کروں گا... مگر آپ یہ دو باتیں سنتے کہاں ہیں، آپ تو انہیں پڑھتے ہیں اور پڑھنے کے لیے کانوں کی ضرورت نہیں: ان سب باتوں کے باوجود میں یہ کہوں گا... بات اس کان کے راز کی نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں، بلکہ یہ ایک اور ہی کان کی بات ہے۔ اب کان کی گردان بہت ہو چکی، ناول پڑھیے۔ جی ہاں اور کیا!
چلتے چلتے آئندہ ناول کا نام بھی سن لیں...
"جاسوس کہیں کا" ہو گا۔

اشتیاق احمد

ترتیب

بلّی کے گلے میں گھنٹی

دروازہ دھڑام کی آواز کے ساتھ کھلا اور ایک بوڑھا آدمی اندر داخل ہوا۔ گھر کے اندر موجود ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکی بوکھلا کر اس کی طرف لپکی۔ بوڑھے کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا آنکھوں میں بے پناہ خوف اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"کیا ہوا بابا؟" لڑکی نے بوکھلا کر کہا۔

"بیٹی! کچھ لوگ میرا تعاقب کر رہے ہیں... وہ مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ جلدی سے دروازہ بند کر لو۔" بوڑھے نے گھبرا کر کہا۔

"ہائے..." لڑکی چیخ مار کر دروازے کی طرف بڑھی اور پھر اس نے چٹخنی لگا دی۔

"وہ کون لوگ ہیں بابا؟" لڑکی نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا.... سب لوگوں کے ساتھ کان سے نکل کر گاڑی میں بیٹھا تھا، لیکن جونہی گاڑی سے اتر کر اسٹیشن سے باہر نکلا، وہ میرے پیچھے لگ گئے... وہ بڑے پُراسرار انداز میں میرا تعاقب کر رہے تھے۔ میں نے انہیں دیکھ لیا تھا، لیکن بھاگ کر

کہاں جا سکتا تھا۔ ان سے تیز بھاگنا تو میرے بس سے باہر تھا۔
چنانچہ میں چلتا رہا، انہوں نے حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"پھر آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ وہ آپ کو ہلاک کرنا چاہتے
ہیں۔" لڑکی نے پریشان ہو کر کہا۔

"ان کے خطرناک ارادے ان کے چہروں سے صاف نظر آ
رہے تھے، میں نے بار بار مڑ کر دیکھا تھا، وہ اتنی وحشیانہ ہنسی ہنسے
تھے کہ میرا پتہ پانی ہو گیا۔"

"سوال یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں... وہ لوگ اگر دروازہ توڑ کر
اندر آ گئے تو کیا ہو گا؟" لڑکی بولی۔

"وہ دروازہ نہیں توڑ سکتے... اس طرح شور پیدا ہو گا اور آس
پاس کے لوگ جمع ہو جائیں گے... پھر وہ انہیں کیا بتائیں گے۔ وہ
کیوں دروازہ توڑ رہے ہیں۔"

"پھر بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اندر داخل ہونے کی کوشش
نہیں کریں گے۔ ہو سکتا ہے، وہ زیادہ رات ہونے کا انتظار کریں۔
اس وقت صرف آٹھ بجے ہیں۔ اگر انہوں نے رات کے بارہ بجے
کسی طرح مکان میں داخل ہونے کی کوشش کی تو انہیں کس
طرح روکا جا سکے گا؟"

"پھر کیا کریں بیٹی... ہم یہاں سے نکل کر بھاگ بھی تو نہیں
سکتے۔" بوڑھے نے مایوس ہو کر کہا۔

"ہم بھاگ سکتے ہیں بابا۔" لڑکی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"کیسے بھاگ سکتے ہیں؟" بوڑھے نے جلدی سے کہا۔

"ہم اپنی چھت والی لکڑی کی سیڑھی کے ذریعے رحمان چچا کی چھت
پر کود جاتے ہیں اور پھر ان کی چھت سے ستار طاہر صاحب کی چھت
پر... دشمنوں کی نظر تو صرف ہمارے دروازے پر جمی ہو گی، لہٰذا
ہم ستار طاہر صاحب کے دروازے سے نکل کر کچھ دور تک آہستہ
آہستہ چلتے رہیں گے اور پھر جب کسی قدر فاصلے پر پہنچ جائیں
گے تو بھاگ کھڑے ہوں گے۔"

"لیکن ہم بھاگ کر جائیں گے کہاں... یوں تمہاری تجویز بہت
اچھی ہے۔" بوڑھے نے فکر مند لہجے میں کہا۔

"ہم پولیس اسٹیشن چلیں گے۔"

"اوہ ہاں... پولیس اسٹیشن نزدیک ہے، ہم وہاں تک آسانی
سے پہنچ جائیں گے۔" بوڑھے کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔ دونوں دبے
پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک
دی ساتھ ہی مردانہ لیکن آہستہ آواز میں کسی نے کہا:

"دروازہ کھولو... ورنہ ہم توڑ دیں گے۔"

"جلدی کرو بابا... کہیں ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہ ہو جس سے
وہ آواز پیدا کیے بغیر بھی دروازہ توڑ سکیں... گلی میں روشنی ناکافی
ہو گی، کیونکہ میونسپل کارپوریشن کا بلب ٹوٹا ہوا ہے... اور ابھی چاند

بھی نہیں نکلا، لہٰذا وہ اس موقعے سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کریں گے... اور ہمیں اس موقعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے...“

”اچھا بیٹی... چلو۔“

وہ چھت پر پہنچے، سیڑھی دیوار سے لگائی اور پھر پہلے بوڑھا اس پر چڑھ کر دیوار پکڑتے ہوئے دوسری طرف لٹک گیا، پھر اس نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ ایک ہلکی سی دھم کی آواز سنائی دی... اس کے بعد لڑکی نے بھی ایسا ہی کیا۔ ستار صاحب کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی، لیکن کسی چیز پر چڑھے بغیر منڈیر تک پہنچنا مشکل تھا، چھت پر ایک بے کار میز نظر آئی، انہوں نے اسے دیوار کے نیچے رکھا، بوڑھا اس پر چڑھا تو وہ چرچرائی.... اور پھر ایک تڑاکے سے ٹوٹ گئی۔

”اوپر کون ہے؟“ نیچے سے رحمان صاحب کی خوف زدہ آواز سنائی دی۔

”اب کیا کریں؟“

”آپ میری کمر پر پیر رکھ کر دیوار تک پہنچ جائیں اور پھر ہاتھ نیچے لٹکا دیں، میں آپ کا ہاتھ پکڑ لوں گی... آپ مجھے کھینچ لیجیے گا۔“

”اچھا... لیکن اگر اتنی دیر میں رحمان بھائی اوپر آ گئے تو؟“

”تو انہیں ساری بات بتا دیں گے۔“ لڑکی بولی اور دیوار کے

ساتھ لگ کر جھک گئی۔

”تم شاید میرا بوجھ نہ سنبھال سکو گی بیٹی۔“

”فکر نہ کریں بابا۔ میں اتنی کمزور نہیں... آپ جلدی کریں۔“

بوڑھے نے اس کی کمر پر ایک پیر رکھا اور بڑی مشکل سے دیوار تک ہاتھ پہنچانے میں کامیاب ہوا۔ آخر منڈیر تک پہنچ گیا۔ اب اس نے ہاتھ نیچے لٹکا دیا۔ عین اسی وقت کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ لڑکی نے سوچا، اگر وہ رُک گئے تو رحمان چچا کو بات بتانے میں کچھ وقت ضائع ہو جائے گا، جب کہ ان کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ اس نے جلدی سے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا اور اوپر اٹھتی چلی گئی۔ جب وہ ستار صاحب کی چھت پر اُتر رہے تھے تو انہوں نے رحمان صاحب کی حیرت اور خوف میں ڈوبی آواز سُنی:

”ارے! چھت پر تو کوئی بھی نہیں ہے۔ تو پھر وہ آواز کیسی تھی۔“

ستار صاحب کی چھت پر اُتر کر وہ زینے کی طرف بڑھے اور جلدی جلدی نیچے اُترنے لگے۔ ستار صاحب اور ان کے گھر کے افراد صحن میں ایک میز کے گرد جمع تھے اور زور شور سے کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے۔ زینے پر قدموں کی آواز سن کر وہ اس طرف مڑے اور پھر چونک اُٹھے:

”ارے! جمال بابا... اور بیٹی نسیمہ... یہ تم اوپر سے کس طرح

نیچے آ رہے ہو؟" ستار صاحب کا لڑکا بولا۔

"مم.... میں خطرے میں ہوں۔ کچھ لوگ مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔" جمال بابا نے جلدی سے کہا۔ اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

"جان سے مار ڈالنا چاہتے ہیں؟" ستار صاحب کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! وہ لوگ میرے گھر کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔ ہم چھت پر چڑھ کر رحمان صاحب کی چھت پر اتر گئے اور پھر آپ کی طرف.... اب ہم یہاں سے نکل کر دائیں طرف مڑ جائیں گے۔"

"لیکن کیا اس طرح تم محفوظ رہو گے۔ ظاہر ہے، وہ بہت جلد یہ اندازہ لگا لیں گے کہ تم چھتوں کے راستے بھاگ نکلے ہو۔" ستار صاحب بولے۔

"اتنے میں وہ یہ اندازہ لگائیں گے، ہم پولیس اسٹیشن پہنچ چکے ہوں گے۔" نسیمہ نے کہا۔

"اوہ ہاں.... بات تو ٹھیک ہے۔ تو پھر ہم بتیاں بجھا دیتے ہیں اور دروازے کھول دیتے ہیں۔ آپ تاریکی کی اوٹ میں بھاگ نکلیں۔" ستار صاحب نے کہا۔

"ہاں! یہ ترکیب بہت اچھی ہے۔" جمال بابا نے کہا۔

ستار صاحب نے آگے بڑھ کر مین سوئچ بند کر دیا اور دروازہ کھول کر اس وقت تک وہیں کھڑے رہے جب تک جمال بابا اور نسیمہ نکل نہ گئے۔ پھر انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر کے چٹخنی لگا دی۔

جمال بابا اور نسیمہ دیوار کے ساتھ ساتھ کچھ دیر تک تو آہستہ آہستہ چلتے رہے اور پھر جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ کافی فاصلے پر نکل آئے ہیں تو ایک دم دوڑ لگا دی۔ لیکن ان کے دوڑتے قدموں کی آواز دشمنوں کے کانوں تک پہنچ گئی، کیونکہ ان کے کچھ ساتھی گلی کے دوسرے سرے پر بھی کھڑے تھے۔

"ارے! یہ کون بھاگا آ رہا ہے۔" دوسرے سرے پر کھڑے دشمنوں میں سے کسی نے کہا اور جمال بابا اور نسیمہ کو اپنے جسموں میں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ دوسری طرف دروازے سے لگے ستار صاحب نے بھی یہ آواز سن لی۔

○

فاروق کے ہاتھ میں گھنٹی تھی، اس گھنٹی میں رسّی بھی پروئی ہوئی تھی، اس نے دوسرے ہاتھ میں اپنی بلّی سوئٹی، دبوچ رکھی تھی اور وہ گھنٹی کو اس کے گلے میں باندھنے کی کوشش میں مصروف تھا جب کہ بلّی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، اسے اپنے دانت دکھا رہی تھی۔

شاید وہ گھنٹی بندھوانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ فاروق کے نئے نئے تجربات اسے ہمیشہ کسی نہ کسی پریشانی سے دو چار کر دیا کرتے تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ اس کوشش میں تھی کہ گھنٹی نہ بندھوائے۔ دوسری طرف فاروق پر گویا گھنٹی باندھنے کا بھوت سوار تھا۔ تھوڑے فاصلے پر محمود اور فرزانہ بیٹھے۔ بے بسی سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس وقت وہ اپنے پائیں باغ والے کمرے میں تھے۔

"آخر آج غریب بلی کی شامت کیوں آگئی ہے۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"کیا ہم لوگ غریب ہیں۔" فاروق نے منہ بنا کر کہا۔

"میں نے تمہیں نہیں، بلی کو غریب کہا ہے۔" محمود تلملا کر کہا۔

"اگر ہم غریب نہیں تو ہماری بلی کیسے غریب ہو سکتی ہے۔" فاروق نے وضاحت کی۔

"لیکن تمہاری بلی تمہیں میاؤں ضرور کہہ رہی ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"کہنے دو۔ یہ تو اس کی عادت ہے۔" فاروق نے لاپروائی سے کہا۔

"میں نے غریب بے چاری کے معنوں میں استعمال کیا تھا۔" محمود نے جلدی سے کہا۔

"تو پھر بہتر تھا، تم لفظ بے چاری ہی استعمال کرتے۔" فاروق نے پھر منہ بنایا۔

"غلطی ہو گئی... تم تو پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتے ہو۔" محمود نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"پنجے نہیں... ہاتھ... پنجے جھاڑ کر تو بلی پیچھے پڑ سکتی ہے۔"

"ہاتھ جھاڑ کر پیچھے نہیں پڑا جاتا بلکہ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑتے ہیں۔" فرزانہ بول اٹھی۔

"کیا آج ہم پر محاوروں کا بھوت سوار ہے۔ تم نے بتایا نہیں، بلی کے گلے میں گھنٹی کیوں باندھ رہے ہو۔" محمود نے پوچھا۔

"چوہوں کی مدد کر رہا ہوں۔"

"کیا مطلب... یہ تمہیں چوہوں سے ہمدردی کب سے ہو گئی۔" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

"بات چوہوں سے ہمدردی کی نہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"تو پھر... بات ہے کیا۔"

"چوہے بے چارے آج تک بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک زمانہ گزرا جب انھوں نے اس سے بچنے کے لیے اس کے گلے میں گھنٹی باندھنے کی تجویز سوچی تھی، لیکن معاملہ یہاں آ کر اٹک گیا تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے گا... آج اچانک مجھے چوہوں سے ہمدردی ہونے لگی اور میں نے سوچا... کیوں نہ کم از کم اپنی بلی کے گلے میں تو گھنٹی باندھ ہی دوں۔ اب میں ساری دنیا کی بلیوں کے گلے میں تو گھنٹی باندھنے سے رہا۔"

فاروق کہتا چلا گیا۔

"نہیں ابھی ابھی تو تم نے کہا تھا کہ بات چوہوں سے ہمدردی کی نہیں ہے۔" فرزانہ نے گھورا۔

"ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔ اصل بات چوہوں سے ہمدردی کی نہیں ہے۔"

"تو کیا بلی سے ہمدردی کی ہے؟" محمود نے کہا۔

"بھلا اس کے گلے میں گھنٹی بندھنے سے ہمدردی کس طرح ثابت ہوتی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"تم جتنے مرضی خیالی گھوڑے دوڑاتے رہو، اصل بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکو گے۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"چلو نہیں دوڑاتے خیالی گھوڑے... یوں بھی ہمارے خیالی گھوڑے اتنے فالتو نہیں... تم خود بتا دو... بات کیا ہے؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ آج کل نہ جانے کیا ہو گیا ہے، مجھے بھوک نہیں لگتی۔"

"کیا مطلب... بھلا بھوک کا بلی کے گلے میں گھنٹی باندھنے سے کیا تعلق؟" محمود نے چونک کر کہا۔ فرزانہ بھی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"میں چاہتا ہوں میرے پیٹ میں چوہے کودنے لگیں... تاکہ مجھے شدید بھوک کا احساس ہونا شروع ہو جائے، لیکن........

جب تک چوہے بے خوف ہو کر بلوں سے باہر نہیں نکلیں گے، اس وقت تک کچھ نہیں ہو سکے گا۔"

"لاحول ولا قوۃ..." محمود اور فرزانہ نے ایک ساتھ کہا، پہلے بڑا سا منہ بنایا اور پھر بے تحاشہ ہنس پڑے۔ دراصل فاروق نے انہیں بے وقوف بنانے کی کامیاب کوشش کی تھی اور وہ اس کی بات سنجیدگی سے سننے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اچانک فرزانہ نے سنبھالا لیا اور جلدی سے بولا:

"لیکن تم ایک بات تو بھول ہی گئے۔"

"وہ کیا؟"

"ہمارے گھر میں تو چوہے ہیں ہی نہیں۔"

"ارے ـــــ واقعی......"

اس کے الفاظ درمیان میں ہی رہ گئے۔ اسی وقت پائیں باغ میں سے ایک عجیب سی آواز آئی تھی۔

موت جھپٹتی ہے

باپ نے بیٹی کی طرف اور بیٹی نے باپ کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، اب کیا کریں، انہوں نے جو سوچا تھا، وہ نہیں ہو سکتا تھا، پولیس اسٹیشن والے راستے پر پہلے ہی دشمن موجود تھے۔ آخر نسیمہ نے جلدی سے کہا:

"آؤ بابا... ایک درمیانی راستہ ہے اور اب اس راستے پر بھاگ نکلنے کے سوا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بابا کا ہاتھ تھاما اور ساتھ ہی مڑنے والی ایک گلی میں داخل ہو گئی۔ اب دونوں بے تحاشہ دوڑ رہے تھے۔

"اب تم مجھے چھوڑ دو بیٹی... اپنی فکر کرو... تم مجھ سے تیز دوڑ سکتی ہو۔" جمال بابا نے کہا۔

"نہیں بابا ___ میں آپ کو چھوڑ کر کیسے بھاگ سکتی ہوں۔ آپ ہمت نہ ہاریں اور بھاگتے رہیں، شاید کسی گھر کا کوئی دروازہ کھلا مل جائے اور ہم اس میں گھس کر اپنی جان بچا سکیں گے۔" نسیمہ نے کہا اور دونوں پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے دوڑنے لگے۔

اچانک کھچ کی آواز آئی اور جمال بابا کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی:

"کیا ہوا بابا؟" نسیمہ نے گھبرا کر کہا۔

"شاید میری ٹانگ میں چاقو آ کر لگا ہے۔ انہوں نے چاقو پھینک کر مارا ہے۔" یہ کہتے ہوئے جمال بابا گرنے لگا....

"اوہ بابا... سنبھلنے کی کوشش کرو... کوئی دم میں وہ لوگ سر پر آ جائیں گے۔ اور کچھ نہیں تو آؤ اس بائیں باغ میں گھس جائیں شاید پناہ کی کوئی جگہ مل جائے۔" نسیمہ نے جمال بابا کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

بات بوڑھے کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے خود کو سنبھال لیا اور لڑکھڑاتے قدموں سے بائیں باغ کی طرف بڑھا۔ حملہ آور جب تک گلی کا موڑ نہ مڑ جاتے... انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے، کیونکہ چاقو بھی اس وقت لگا تھا جب وہ گلی میں داخل ہوئے تھے اور جمال بابا اور نسیمہ دوسرا موڑ مڑ رہے تھے۔ لہٰذا ان کے پاس چند سیکنڈ تھے... اور نسیمہ اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھی، اس نے سہارا دیتے ہوئے جلد از جلد باغ میں داخل ہونے کی کوشش کی... اِدھر وہ باغ میں گھسے.... اُدھر بھاری قدموں کی آوازوں سے گلی میں گونج سی پیدا ہو گئی۔ ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ پھر دوڑتے قدم ان کے پاس سے ہوتے آگے

گزر گئے۔

"وہ لوگ آگے چلے گئے بابا۔" نسیمہ نے خوش ہو کر کہا۔

"وہ پھر بھی واپس آ سکتے ہیں بیٹی۔"

"اللہ مالک ہے بابا... آؤ ہم اس پائیں باغ کے اندر اندر گھس جائیں۔"

"خدا جانے یہ کس کا ہو۔" جمال بابا نے کہا۔

"کسی کا بھی ہو... اس وقت ہمارے لیے اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں۔"

دونوں گرتے پڑتے پائیں باغ کے اندر تک چلے گئے پھر ایک جگہ بوڑھا جمال بابا گر گیا۔

"اب مجھ سے آگے قدم نہیں اٹھایا جاتا بیٹی۔"

"ٹھیک ہے بابا... کیا چاقو ابھی ٹانگ میں ہی ہے۔"

"ہاں۔" بوڑھے کے منہ سے نکلا۔

"اوہ! اب کیا کریں... کیا میں چاقو نکال کر اپنا دوپٹہ اوپر باندھ دوں۔"

"اندھیرے میں یہ کام تم کس طرح کر سکو گی بیٹی۔" جمال بابا نے فکرمند ہو کر کہا۔

"تو پھر جس گھر کا یہ پائیں باغ ہے، ان سے مدد کیوں نہ مانگی جائے۔" نسیمہ بولی۔

"آج کل کم ہی لوگ دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ ان حالات میں تو اور بھی مشکل ہے، کیوں کہ ہمیں بچانے والے یا ہماری مدد کرنے والے خود بھی مصیبت میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔"

"پھر بھی ابھی اچھے لوگ باقی ہیں۔ میں پائیں باغ سے نکل کر مکان کے دروازے پر جانے کی کوشش کرتی ہوں... تم یہیں دبکے رہو۔"

"اچھا بیٹی...." جمال بابا کے منہ سے نکلا۔

ساتھ ہی اس کے منہ سے ایک تیز کراہ نکلی۔ نسیمہ نے کراہ سنی اور پھر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

○

"یہ آواز کیسی تھی۔" فاروق چونکا۔

"شاید بلی کے حلق سے نکلی تھی۔" محمود نے کہا۔

"بلیاں اس طرح نہیں کراہا کرتیں۔" فرزانہ نے جھلا کر کہا۔

"تو پھر کس طرح کراہا کرتی ہیں۔" محمود نے بھی برا مان کر کہا۔

"کسی دن اس کے کراہنے کی آواز ٹیپ کر لوں تو پھر سنوا دوں گی۔" فرزانہ مسکرائی اور پھر بولی:

"آواز کسی انسان کے کراہنے کی تھی اور یہ آواز ہمارے پائیں باغ سے آئی تھی۔"

"اوہ... پھر تو ہمیں فوراً چل کر دیکھنا چاہیے۔ کیا معاملہ ہے؟" فاروق نے بلی کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

"کہیں کسی نے ہمیں جال میں پھانسنے کا پروگرام نہ بنایا ہو۔" فرزانہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

"جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے، خود اس میں گرتا ہے۔" محمود بولا۔

تینوں اٹھ کھڑے ہوئے اور پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگے، لیکن اندھیرے میں کیا نظر آتا۔

"کیا خیال ہے، بلب جلا کر دیکھوں؟" محمود نے کہا۔

"ایسی حماقت بھی نہ کرنا... ہو سکتا ہے، پائیں باغ میں واقعی ہمارا کوئی دشمن موجود ہو۔"

"اگر دشمن ہوتا تو اس وقت تک ہم پر فائر کر چکا ہوتا، کیونکہ ہم بے شک اسے نہیں دیکھ سکتے، لیکن کمرے میں روشنی ہونے کی وجہ سے وہ ضرور ہمیں دیکھ سکتا ہے۔" محمود نے کہا۔

"لیکن یہ تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی دشمن سے چھپنے کے لیے باغ میں آ گھسا ہو... روشنی اس کے لیے تو نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"ہاں! یہ ٹھیک ہے... تو پھر میں اکیلا نیچے اتر کر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔" محمود نے کہا اور کھڑکی پھلانگ گیا۔ جلد ہی وہ

اس شخص کے پاس پہنچ گیا... جو گلاب کے پودوں کے پاس زمین پر پڑا تھا۔

"تم کون ہو... کیا معاملہ ہے؟" محمود نے سرگوشی کی، لیکن اس شخص نے کوئی جواب نہ دیا۔ محمود نے اسے ہلا جلا کر دیکھا... اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ شخص بے ہوش ہے، اس نے ایک خاص انداز میں سیٹی بجائی، فوراً ہی فاروق اور فرزانہ بھی اس کے پاس پہنچ گئے۔

"یہ شخص بے ہوش ہے۔" اس نے کہا۔

"تو پھر اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے چلتے ہیں۔" فرزانہ بولی۔

"کیا ہم اسے اتنا اونچا اٹھا سکتے ہیں کہ کھڑکی کے راستے اندر پہنچا سکیں؟" فاروق نے سوال کیا۔

"اس طرح اسے چوٹ لگ سکتی ہے۔ ہمیں دروازے کی طرف سے لے جانا ہوگا۔ فاروق تم کھڑکی کے راستے جا کر اندر دروازہ کھول دو اور یہاں آ جاؤ... پھر ہم تینوں اسے اٹھا کر لے چلیں گے۔"

"بہت اچھا۔" فاروق نے کہا اور کھڑکی کی طرف چلا گیا۔ جلد ہی وہ پائیں باغ کے دروازے میں سے ہوتا ان تک پہنچ گیا۔ تینوں نے مل کر اس بوڑھے کو اٹھایا اور اندر اپنے کمرے میں لے آئے، انہوں نے کھڑکی اور دروازہ اندر سے

بند کر لیے۔ اب جو انہوں نے اس کا اور اپنا جائزہ لیا تو چونک
اٹھے۔ ان کے کپڑے بھی خون آلود ہو چکے تھے اور بوڑھے کی
تو ایک ٹانگ خون میں تر تھی۔
"ارے باپ رے! یہ تو اچھا بھلا زخمی ہے۔"
"اور ٹانگ میں ابھی تک چاقو موجود ہے۔ فوراً چاقو نکال
کر پٹی کرنے کی تیاری کرو... میں جا کر ابا جان کو بتا دوں، شاید
مجھے ڈاکٹر صاحب کو فون کرنے کے لیے بیگم شیرازی کے ہاں
بھی جانا پڑے..." محمود کہتا چلا گیا۔
"اب ان کے ہاں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو ہمارے
ہاں فون لگ ہی چکا ہے۔" فرزانہ مسکرائی۔
"اوہ! میں تو بھول ہی گیا، دراصل اتنے سالوں سے یہی
عادت پڑی ہوئی تھی نا... کہ جب بھی فون کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی،
بیگم شیرازی کے گھر چلے جاتے تھے۔ خیر... ابا جان خود ہی ڈاکٹر کو
فون کر دیں گے اور آ کر اس کا جائزہ بھی لے لیں گے، نہ جانے یہ
بے چارا کون ہے اور ہمارے پائیں باغ میں کس طرح پہنچ گیا۔
خنجر سے اس پر حملہ کرنے والا کون تھا۔ اسے اس سے کیا دشمنی تھی۔"
یہ کہتے ہوئے محمود کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ اپنے
والد کے کمرے میں داخل ہوا، انسپکٹر جمشید کسی موٹی سی کتاب کے مطالعے
میں مگن تھے، بیگم جمشید سوئٹر بن رہی تھیں۔

پندرہ منٹ بعد وہ اس کے گرد بیٹھے تھے۔ اس کی ٹانگ میں
سے چاقو نکال کر پٹی کر دی گئی تھی۔ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔
محمود نے جا کر دروازہ کھولا تو ڈاکٹر کا چہرہ نظر آیا۔ ڈاکٹر نے اس
کے زخم کا معائنہ کیا۔ زخم صاف کیا، دوا لگائی اور پٹی کر دی۔ اس
کے بعد اس نے اسے دو انجکشن دیے۔
"چاقو گوشت میں دور تک چلا گیا ہے، لیکن نقصان زیادہ نہیں
ہوا، کیونکہ چاقو کا پھل زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ یہ تقریباً دو گھنٹے تک
ہوش میں آ جائیں گے۔ ابھی تین دن تک بستر سے ہلنے نہ دیا
جائے۔ یہ ہیں کون؟"
"ہمیں خود معلوم نہیں، ہمارے پائیں باغ میں بے ہوش
پڑے ملے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔
"کیا آپ پولیس کو اطلاع دے چکے ہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔
"جی ہاں! آپ فکر نہ کریں۔ پولیس آتی ہی ہو گی۔ خدا جانے یہ
غریب کون ہے اور کس نے اس پر یہ ظلم توڑا ہے۔" انسپکٹر جمشید
جذباتی آواز میں بولے۔
"اچھا تو میں چلتا ہوں۔ اگر یہ دو گھنٹے تک ہوش میں نہ آئے
تو مجھے پھر بلا بھیجیے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ گھر جا کر سو نہ جاؤں،
ویسے تو مجھے امید ہے کہ بہت جلد ہوش میں آ جائے گا۔"
"بہت بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔" یہ کہتے ہوئے انسپکٹر جمشید

نے ڈاکٹر کی فیس ادا کی اور محمود نے کر انہیں دروازے تک رخصت کیا پھر دروازہ اندر سے بند کر کے اندر آ کر سب کے پاس بیٹھ گیا۔

"خدا جانے بے چارا کون ہے!" بیگم جمشید کے منہ سے نکلا۔

"تم تینوں کا کیا خیال ہے۔ یہ کون ہو سکتا ہے؟" انسپکٹر جمشید نے محمود، فاروق اور فرزانہ سے پوچھا۔

"جی... بھلا ہم کیا بتا سکتے ہیں؟" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"کیوں... بتا کیوں نہیں سکتے... کیا خدا نے تمہیں آنکھیں نہیں دیں؟" فرزانہ تیزی سے بولی۔

"آنکھیں تو اس نے تمہیں بھی دی ہیں۔ تو پھر تم کیوں نہیں بتا دیتیں؟" محمود نے جل کر کہا۔

"ہاں کیوں نہیں... میں بتا سکتی ہوں۔ یہ ایک غریب آدمی ہے۔"

"یہ بات تو اس کے کپڑوں کو دیکھ کر ایک بے وقوف ترین آدمی بھی بتا سکتا ہے۔" فاروق جھنجھلا کر بولا۔

"اور میرے یہ بات بتانے سے پہلے تم نہیں بتا سکے۔" فرزانہ مسکرائی۔

"آپس میں بحث کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ فرزانہ کچھ اور بھی اندازہ لگا سکتی ہو؟"

"جی ہاں... میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ ہمارے گھر کے

نزدیک ہی کہیں رہتا ہے۔"

"یہ بات تم یقین سے کس طرح کہہ سکتی ہو؟" فاروق نے پوچھا۔

"اس طرح کہ... یہ شخص دشمنوں کے مقابلے میں زیادہ تیز نہیں دوڑ سکا ہوگا اور انہوں نے جلد ہی اسے آ لیا ہوگا، پھر خنجر اس پر پھینک کر چلتے بنے ہوں گے۔ یہ سمجھ کر کہ خنجر اس کے ایسی جگہ لگ گیا ہے... کہ اب بچ نہیں سکتا۔" فرزانہ کہتی چلی گئی۔ محمود اور فاروق اس کی بات سے کچھ اتفاق کرتے نظر آئے، انہوں نے انسپکٹر جمشید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں آپ کا کیا خیال ہے۔

"پہلے تم تینوں اپنے اپنے خیال بتا ڈالو۔ پھر میں کچھ کہوں گا۔"

"ہم فرزانہ کی یہ بات تو درست مانتے ہیں کہ یہ شخص کہیں نزدیک ہی رہتا ہے، لیکن یہ بات ذہن میں نہیں سماتی کہ دشمن اس کی موت کا یقین کیے بغیر چلے گئے ہوں گے۔" فاروق بولا۔

"تم کیا کہتے ہو محمود؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہی جو فاروق نے کہا ہے۔"

"بہت خوب...... بیگم.... کیا تم بھی کوئی خیال ظاہر کرو گی؟"

"مجھے تو جاسوسی سے معاف ہی رکھیے... گھر کا ایک آدمی تو ایسا ہونا چاہیے جو صرف گھر کے کاموں کے لیے ہو، میں بھی ان چکروں میں الجھ گئی تو پھر گھر کا کام کاج کون کیا کرے گا۔" بیگم جمشید نے گھر کی بات کہی

اور وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"اچھا تو اب مجھ سے سنو کہ میں نے کیا اندازے لگائے ہیں۔"
یہ کہتے ہوئے وہ مسکرائے، پھر کہنے لگے:

"پہلی بات تو یہ کہ یہ ایک کان کن ہے..."

"جی... کان کن... یعنی کانوں میں کھدائی کرنے والا؟"
محمود نے حیرت زدہ لہجے میں کہا، فاروق، فرزانہ اور بیگم جمشید بھی انہیں گھور کر دیکھنے لگے۔

"ہاں! یہ کان کن ہے۔ دوسری بات یہ کہ بہت غریب آدمی ہے، یہ بھی ٹھیک ہے کہ کہیں آس پاس رہتا ہے، لیکن ایک اور بھی اہم بات ہے۔ جو تم لوگوں نے نظر انداز کر دی ہے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید معنی خیز انداز میں مسکرائے اور خاموش ہو گئے۔

"اور وہ اہم بات کیا ہے ابا جان؟" فرزانہ نے بے تابی کے عالم میں پوچھا۔

"وہ یہ کہ اس کے ساتھ..."

عین اسی وقت زخمی کے منہ سے ایک کراہ نکلی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پھر سب سے پہلے اس کے منہ سے جو جملہ نکلا وہ یہ تھا:

"تسیمہ بیٹی! میں کہاں ہوں؟"

بیگم جمشید میدان میں

انہوں نے چونک کر اپنے اباجان کی طرف دیکھا۔ محمود نے حیرت زدہ لہجے میں کہا:

"اباجان: کیا آپ بھی کہنے والے تھے کہ اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی؟"

"ہاں! اس کے جسم پر لمبے لمبے بال دیکھ رہے ہو۔ یہ کسی لڑکی کے ہی ہو سکتے ہیں...؟"

"اوہ... اگر اس کی بیٹی اس کے ساتھ تھی تو وہ کہاں گئی؟" فرزانہ نے بوکھلا کر کہا۔

"یہ تو یہ پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد ہی بتا سکتا ہے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید جھک گئے اور نرم آواز میں بولے:

"آپ بالکل خیریت سے ہیں اور محفوظ جگہ پر ہیں۔ یہ بتائیے۔ آپ کون ہیں اور آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟" ان کے ساتھ محمود، فاروق اور فرزانہ بھی اس پر جھک گئے۔

"میں... میں جمال ہوں۔ لوگ مجھے جمال بابا کہتے ہیں۔ گر میری

بیٹی یہاں نظر نہیں آ رہی۔" اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا وہ آپ کے ساتھ تھی؟"

"ہاں! اس کا نام نسیمہ ہے۔ میں دشمنوں سے بچنے کے لیے آپ کے پائیں باغ میں گھس گیا تھا۔۔۔ پھر میری بیٹی آپ کے دروازے پر دستک دینے چلی گئی تھی۔ تاکہ مدد حاصل کر سکے۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا۔" بوڑھے نے بتایا۔

"اوہ!" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا، کیونکہ وہ یہ سن کر حیران رہ گئے تھے اور سوچ میں پڑ گئے کہ جمال بابا کی بیٹی کہاں چلی گئی اور وہ انہیں کیا جواب دیں۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"ہم نے بھی آپ کو پائیں باغ میں پڑے پایا ہے، لیکن آپ کی بیٹی نے ہمارے دروازے پر دستک نہیں دی تھی، ہم تو آپ کے منہ سے نکلنے والی کراہ سن کر پائیں باغ میں پہنچے تھے۔

"کیا۔۔۔ تو پھر میری بیٹی کہاں گئی؟" اس نے بدحواس ہو کر کہا۔

"گھبرائیں نہیں۔۔۔ ہم ابھی اس کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ بیگم تم ان کا خیال رکھنا۔۔۔ دروازے اندر سے بند کر لو۔ جہاں تک میرا خیال ہے۔ جب ان کی بیٹی دروازے پر دستک دینے آ رہی تھی تو دشمن بھی دروازے پر پہنچ چکے تھے اور شاید وہی اسے اٹھا لے گئے ہیں۔"

"لیکن انہیں اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ تو میری جان

لینا چاہتے تھے۔

"آپ ان کے ہاتھ نہیں لگے۔۔۔ یا پھر انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ آپ کے خنجر تو لگ ہی چکا ہے، آپ کیا بچیں گے، لہذا انہوں نے سوچا۔۔۔ کیوں نہ آپ کی بیٹی کو لے جائیں۔"

"لیکن انہیں میری بیٹی کو اٹھا کر لے جانے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟"

"یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ فی الحال تو ہم آپ کی بیٹی کی تلاش میں نکلتے ہیں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سب سے پہلے ہم پائیں باغ کا جائزہ لیں گے اور اس کے بعد دروازے کا، پھر اکرام اور پولیس اسٹیشن کو فون کریں گے، لیکن نہیں۔۔۔ سب سے پہلے پولیس اسٹیشن اور اکرام کو فون کرنا چاہیے۔ تاکہ اغوا کرنے والے زیادہ دور نہ جانے پائیں۔" یہ کہہ کر وہ تیزی سے ڈرائینگ روم کی طرف چلے گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ وہیں کھڑے رہ گئے۔ چند منٹ بعد انسپکٹر جمشید آئے اور جلدی سے پائیں باغ میں پہنچے، انہوں نے بلب جلا لیا۔ ارد گرد کا جائزہ لیا گیا، لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔ پھر وہ دروازے پر آئے، یہاں کچھ قدموں کے نشانات زمین پر پائے گئے، نشانات بالکل تازہ تھے۔ ان میں چند نشان ایک زنانہ چپل کے بھی تھے۔ جو صرف دروازے پر موجود تھے۔ جس کا مطلب

یہ تھا کہ اس جگہ سے ہی لڑکی کو اٹھا لیا گیا تھا، کیوں کہ وہ اندر تو گئی نہیں تھی اور دروازے سے کچھ فاصلے پر اس کے پیر بھی کے نشانات نہیں تھے۔

"لڑکی کو اغوا کیا جا چکا ہے۔" آخر انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"اب ہم کیا کریں گے؟"

"ہمارے گھر سے چار راستے نکلتے ہیں۔ ہم چاروں الگ الگ روانہ ہوں گے۔ پولیس پارٹیاں بھی ہمیں انہیں راستوں پر کہیں ملیں گی، لیکن ہمارے جائزہ لینے کا انداز ذرا مختلف ہے، کوئی سراغ مل جائے تو پھر پیچھے ہٹنے کی ضرورت نہیں۔ آگے ہی بڑھتے چلے جانا.... اس لڑکی کو اگر ہم زندہ سلامت واپس حاصل نہ کر سکے تو مجھے زندگی بھر افسوس ہو گا۔" انسپکٹر جمشید جذباتی انداز میں کہتے چلے گئے۔

"بہت بہتر ابا جان! آپ فکر نہ کریں۔" محمود نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے کہا اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ بیگم جمشید نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور زخمی کے کمرے میں آ کر کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اس کی ایک بار پھر آنکھ لگ چکی تھی، کیونکہ ہوش میں آنے پر اسے ایک خوراک دوائی دی گئی تھی۔ اس خوراک میں سرور نیند کی گولی بھی شامل ہو گی، ورنہ بیٹی کی گم شدگی کی خبر سننے کے بعد اسے نیند نہیں آ سکتی تھی۔ اچانک انہیں خیال آیا، کہیں پائیں باغ والی کھڑکی کھلی نہ رہ گئی ہو، یہ سوچ کر وہ اٹھیں اور محمود، فاروق اور فرزانہ کے کمرے میں آئیں۔

ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ کمرے میں ایک نقاب پوش کھڑا تھا۔ چہرے پر منڈھے ہوئے کپڑے میں آنکھوں کی جگہ دو سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے شعلے کی طرح سرخ آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ اس کے دائیں ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک ننھا سا پستول بھی تھا۔

"کیا وہ یہیں ہے؟" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کون؟" بیگم جمشید بے خوفی سے بولیں۔

"وہی بوڑھا... جس کی ایک ٹانگ زخمی ہو چکی ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا تم کھڑکی کے راستے اندر آئے ہو؟" بیگم جمشید نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے سوال کر ڈالا۔

"ہاں! کیونکہ صدر دروازہ بند تھا۔"

اب بیگم جمشید کو یاد آیا۔ جس وقت محمود، فاروق اور فرزانہ پائیں باغ میں کود گئے تھے اور فاروق نے دوبارہ اندر آ کر دروازہ اندر سے کھول ڈالا تھا، پھر وہ زخمی بوڑھے کو اٹھا کر اندر لے گئے تھے تو پھر اس کے بعد انہیں اپنے کمرے کی کھڑکی بند کرنے کا

"تم میرا راستہ کس طرح روک گی" نقاب پوش نے مسکرا کر پوچھا۔

"اپنی جان پر کھیل جاؤں گی۔ جیتے جی تو تمہیں اس تک پہنچنے نہیں دوں گی۔"

"ٹھیک ہے کھیل جاؤ... میں اس کی طرف جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا، بیگم جمشید پریشان ہو گئیں کہ کیا کریں۔ اچانک انہیں یاد آیا، ایسے موقعوں پر محمود، فاروق اور فرزانہ دشمنوں کو باتوں میں لگا لیا کرتے ہیں، یہ سوچ کر انھوں نے کہا:

"سنو! آخر اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ وہ تو ایک غریب آدمی نظر آتا ہے۔ اس کے زندہ رہنے سے تمہیں کیا نقصان ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم.... میں تمہارے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔" اس نے رکتے رکتے کہا۔

"تو اس کا مطلب ہے تم کسی کے چچے ہو۔"

"چچے.... کیا مطلب؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تم چچے کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ ہمارے ملک میں اس لفظ کا استعمال بہت عام ہے۔" بیگم جمشید مسکرائیں۔

"میں نہیں جانتا.... پہلی مرتبہ سنا ہے۔ اتنا ضرور جانتا ہوں کہ چمچہ کھانے کا ایک آلہ ہوتا ہے۔"

"تو پھر جو دوسروں کے لیے ایسے کام کرے، وہ اس کا آلۂ کار ہوا اور اسے ملکی زبان میں چچہ کہتے ہیں۔"

کوئی موقع نہیں ملا تھا اور شاید وہ بھول بھی گئے تھے۔

"تم کیا چاہتے ہو؟" بیگم جمشید نے پوچھا۔

"ہم جانتے ہیں۔ وہ یہیں موجود ہے اور ظاہر ہے بے ہوش پڑا ہوگا، ہم چاہتے ہیں۔ وہ کبھی ہوش میں نہ آئے۔" اس نے سرد آواز میں کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے یقین سے کہا ہے کہ اسے دو گھنٹے تک ہوش آ جائے گا۔" بیگم جمشید نے کہا۔

"بہت خوب! تو وہ یہاں موجود ہے؟"

"ہاں! میں نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں بولا، لہذا اس وقت بھی نہیں بولوں گی، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارا ارادہ جانے بغیر ہی تمہیں اس تک جانے کی اجازت دے دوں گی۔" بیگم جمشید کا لہجہ ناخوش گوار تھا۔

"خیر.... تو سنو، میرا ارادہ صرف یہ ہے کہ اسے نہایت خاموشی سے ختم کر دوں... میرے چہرے پر نقاب ہے، اس لیے تم مجھے کبھی نہ پہچان پاؤ گی۔ چاہے میں تمہارے آس پاس چکراتا پھروں...."

"میں بھی تمہیں ایک بات بتائے دیتی ہوں اور وہ یہ کہ ہم اسے پناہ دے چکے ہیں، اور اس کی حفاظت ہمارا فرض ہے لہذا تم اس تک نہیں جا سکتے...."

اب سمجھا... مجھے غصہ دلانے کی کوشش نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو، میں اس کے ساتھ تمہیں بھی تہس نہس کر دوں۔"

"میں موت سے نہیں ڈرتی... بلکہ اس گھر کا کوئی آدمی بھی موت سے نہیں ڈرتا"...

"شاید اس لیے کہ انہوں نے کبھی موت آتے دیکھی نہیں۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"اگر اتنے ہی بہادر ہو تو نقاب پہن کر کس لیے آتے ہو؟" بیگم جمشید بولیں۔

"اس لیے کہ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ عقل بھی رکھتا ہوں۔"

"بہت خوب.... اب تم اپنی بہادری اور عقل مندی سے کام لے کر جو کرنا ہے، کرو، میں اپنا کام کرتی ہوں۔"

"تم کیا کرو گی؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"جو میرا جی چاہے گا، کروں گی، تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔"

"کرتی رہو۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ان کے قریب سے گزرنے لگا، بیگم جمشید نے نہایت تیزی سے اس کے پستول کی نالی پر ہاتھ ڈال کر ایک ہلکا سا جھٹکا دیا اور پستول ان کے ہاتھ میں چلا آیا۔ یہی نہیں، انہوں نے پلک جھپکتے میں نالی دشمن کی طرف کر دی۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک عورت اس طرح پستول پر ہاتھ

بھی ڈال سکتی ہے۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اب کیا خیال ہے؟" بیگم جمشید مسکرائیں۔

"کیا تم پستول چلانا جانتی ہو؟" اس نے بوکھلا کر کہا۔

"نہ صرف چلانا جانتی ہوں، بلکہ بہت اچھا نشانہ بھی لے سکتی ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کس طرح پستول تمہارے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں آ سکتا تھا؟"

"میں اس پر یقین نہیں کر سکتا۔" اس کے لہجے میں واقعی بے یقینی تھی۔

"نہ کرو... آگے قدم بڑھا کر دیکھ لو۔ سب سے پہلے تمہارے دائیں کان کی لو اڑاؤں گی۔ جو اس بات کا ثبوت ہوگا کہ میرا نشانہ کیسا ہے۔ ویسے تم اس خیال سے قدم اٹھانے کا ارادہ ترک نہ کرو کہ کہیں گولی کان کی لو کی بجائے تمہاری کھوپڑی میں نہ گھس جائے، بے فکر رہو، کھوپڑی پہلے نمبر میں بالکل محفوظ رہے گی۔ البتہ کان کی لو کی میں ضمانت نہیں دے سکتی۔" وہ کہتی چلی گئیں۔

نقاب پوش کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس قسم کی عورت سے اس کا واسطہ پڑ گیا ہے۔ آخر اس نے سنبھل کر کہا:

"تم مجھے ڈرانے کی کوشش میں ہو، خود بھی مجھ سے ڈر رہی ہو، اب میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤں گا۔ لاؤ پستول مجھے دے دو۔"

تمہارے ہاتھ اسے نہیں چلا سکتے۔" یہ کہہ کر وہ ایک قدم اُس کی طرف بڑھا۔

"خبردار... اب میری طرف اور قدم نہ اُٹھانا... میں بلاوجہ خون بہانا پسند نہیں کرتی۔ لیکن اگر تم آگے بڑھے تو میں فائر کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔"

"میں بے وقوف نہیں جو تمہاری باتوں میں آ جاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک قدم اور اٹھانے کی کوشش کی ہی تھی کہ بیگم جمشید جلدی سے بولیں:

"اچھا... پہلے میری ایک بات سن لو۔"

"دیکھا! میں نہ کہتا تھا۔ تمہیں پستول چلانا نہیں آتا، یونہی مجھے ڈرا رہی ہو۔"

"یہی ثابت کرنا چاہتی ہوں۔ میں نہیں جانتی، تم کون ہو اور اس غریب آدمی کو کیوں ختم کرنا چاہتے ہو۔ اس کے باوجود میں تمہیں نقصان پہنچانا نہیں چاہتی۔ تمہاری خاطر میں اپنے گھر کا ایک گل دان قربان کرنے پر تیار ہوں۔ آتش دان کی طرف دیکھو... شیشے کا گل دان رکھا ہے۔ میں اس پر فائر کر رہی ہوں۔ اگر گل دان غائب ہو گیا تو سمجھ لینا، تمہارے کان کی لو بھی اُڑا سکتی ہوں۔ ورنہ تم میری طرف بڑھ کر پستول چھین سکتے ہو۔"

نقاب پوش نے چند لمحے کے لیے سوچا، آخر بولا:

"ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ہی انھوں نے فائر کر دیا۔ پستول بے آواز تھا، لیکن گل دان کے ٹوٹنے کی آواز کمرے میں ضرور گونج کر رہ گئی۔ نقاب پوش دھک سے رہ گیا۔ اسی وقت بیگم جمشید بولیں:

"ہاتھ اوپر اُٹھا دو۔" انھوں نے یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

زندگی خطرے میں

بیگم جمشید سوچ میں پڑ گئیں کہ کیا کریں۔ فون اسی کمرے میں موجود تھا جس کمرے میں انہوں نے زخمی کو رکھا تھا۔ آخر انہوں نے کہا:

"میرے آگے آگے چلو۔ تمہارے ہاتھ نیچے نہ گرنے پائیں۔"

اب وہ یہ جان چکا تھا کہ یہ عورت اور کچھ کر سکے یا نہ کر سکے، ٹھیک نشانہ لے کر فائر ضرور کر سکتی ہے، اس لیے چپ چاپ ان کے آگے چلنے لگا۔ اسی طرح چلتے ہوئے وہ فون والے کمرے میں آئے۔ بستر پر پڑے بے ہوش زخمی کو دیکھ کر نقاب پوش کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کے منہ سے نکلا:

"بہت خوب... تو یہ یہاں ہے۔"

"خبردار! اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔" بیگم جمشید غرائیں پھر بولیں: "دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ ادھر مڑ کر دیکھا اور میں نے فائر کیا۔"

اس نے فوراً تعمیل کی۔ دوسری طرف فون کی گھنٹی بدستور بج رہی تھی، انہوں نے بائیں ہاتھ سے ریسیور اٹھا کر کان سے

لگا لیا۔ دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کی نالی بدستور نقاب پوش کی طرف رہی۔

"ہیلو... کون صاحب ہیں؟"

"میں کون ہوں، تمہیں اس سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔ غور سے سنو۔ تمہارے گھر میں اس وقت ایک زخمی شخص اور دوسرا نقاب پوش موجود ہے۔"

"اچھا تو پھر؟" بیگم جمشید کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"کیا اس نقاب پوش نے تمہیں پستول کی زد پر لے رکھا ہے؟"

"نہیں... بلکہ میں نے اسے پستول کی زد پر لے رکھا ہے۔"

"اسی لیے تو وہ اب تک تمہارے پاس نہیں پہنچا۔"

"تو پھر تم اسے واپس بھیج دو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"بہت خوب... بھلا میں اسے کیوں واپس بھیج دوں۔" بیگم جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس لیے کہ حالات کی باگ ڈور اس وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔"

"وہ کیسے... ذرا میں بھی تو سنوں!" بیگم جمشید نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"تمہارے شوہر اور بچے گھر سے نکل کر کہیں جا چکے ہیں، ہم نے انہیں خود جاتے دیکھا ہے۔ اب تم گھر میں تنہا ہو۔ یہ شخص

جیسے تم نے پستول کی زد پر لے رکھا ہے، اس کا پستول اسے
واپس کر دو اور جو یہ کرنا چاہتا ہے، کرنے دو۔"
"یہ کیا بات ہوئی، بھلا میں اسے ایک انسان کو قتل کرنے کی
اجازت کس طرح دے سکتی ہوں۔" بیگم جمشید نے بڑا سا منہ
بنا کر کہا۔
"تمہیں ایسا کرنا ہی پڑے گا۔ تم مجبور ہو۔" فون میں کہا گیا۔
"کیا مطلب؟" بیگم جمشید چونکیں۔
"سنو! تمہاری زندگی میں شاید ایسا لمحہ کبھی نہ آیا ہو گا جو ابھی
آنے والا ہے۔ ہم نہیں جانتے۔ تمہاری کیا حالت ہونے والی ہے۔
کیا تم اس شخص سے واقف ہو جو تمہارے ہاں زخمی پڑا ہے۔"
"نہیں! میں نے آج اسے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔"
"بہت خوب! پھر تو تمہیں اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہو گی۔"
دوسری طرف سے کہا گیا۔
"اس لئے ہمارے گھر میں پناہ لی ہے۔ اس کی حفاظت ہمارا
فرض ہے... اور یہ بات ہمدردی سے بھی زیادہ اہم ہے، دوسرے
یہ کہ یہ ایک انسان ہے۔ ایسا انسان جو زخمی بھی ہے، ان حالات
میں تو اس سے ہمدردی کا ہونا بھی قدرتی بات ہے۔"
"لیکن تم چند بچوں کی ماں بھی تو ہو اور مائیں بچوں کو زیادہ
عزیز رکھتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" بیگم جمشید کے منہ سے خوف زدہ انداز میں
نکلا۔ ان کے ذہن میں پہلی بات یہ ہوئی کہ محمود، فاروق اور
فرزانہ میں سے کوئی ان کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ ان کا دل دھک
دھک کرنے لگا۔ آنکھیں پھیل گئیں:
"مطلب یہ کہ تمہیں اب دو راستوں میں سے ایک منتخب کرنا
ہے۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔
"صاف صاف کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟" انہوں نے شدید
بے چینی محسوس کرتے ہوئے کہا۔
"تمہارے گھر میں جو شخص زخمی پڑا ہے۔ اس کی بیٹی ہمارے
قبضے میں ہے۔ اگر تم نے پستول ہمارے ساتھی کو نہ دے دیا
اور اس زخمی شخص کو ختم نہ کرنے دیا تو ہم لڑکی کو ختم کر دیں گے۔
اب تم فیصلہ کر لو۔ کسے بچانا چاہو گی۔"
دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ بیگم جمشید کے کانوں میں
سنسناہٹ ہونے لگی، یہ صورتِ حال انتہائی عجیب و غریب
اور خوفناک تھی۔ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ اس شخص کی بیٹی
کی بجائے ان کا اپنا کوئی بچہ دشمنوں کے قبضے میں ہوتا تو وہ بغیر
سوچے سمجھے یہ کہہ سکتی تھیں۔ تم میرے بیٹے کو ہلاک کر سکتے ہو،
میں زخمی کی طرف کسی کا ہاتھ بڑھتے نہیں دیکھ سکتی، لیکن اب۔
اب وہ کیا جواب دیں۔

"خاموش کیوں ہو گئیں.... بولتی کیوں نہیں۔ تم تو بڑے دعوے کر رہی تھیں۔"

"یہ صورتِ حال غیر معمولی ہے۔ زخمی بھی بے ہوش پڑا ہے۔ ان حالات میں میں کیا کہہ سکتی ہوں۔" انہوں نے جواب میں کہا۔

"ہم تمہیں صرف ایک منٹ دیتے ہیں۔ ایک منٹ بعد ہم لڑکی کو ختم کر دیں گے۔"

"تم کہاں سے بول رہے ہو۔ کس نمبر سے فون کر رہے ہو۔" بیگم جمشید نے پوچھا۔

"یہ نہیں بتایا جا سکتا۔"

"مجھے کیا کرنا ہو گا..." بیگم جمشید نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

"پستول ہمارے ساتھی کے حوالے کر دو اور اس کے ساتھ ہی فون کا ریسیور بھی۔ تاکہ وہ ہمیں بتا سکے کہ تم نے ایسا کر ڈالا ہے۔"

"اور اگر میں ایسا نہ کروں تو تم لڑکی کو شوٹ کر دو گے؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں!"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ لڑکی تمہارے قبضے میں ہے۔"

"ہم فون پر اس سے بات کرا دیتے ہیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"بہت خوب! میں بھی یہی چاہتی ہوں۔"

"اچھی بات ہے۔ لو بات کر لو۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔ پھر ایک لڑکی کی تھر تھر کانپتی آواز آئی:

"مم... میں نسیمہ ہوں۔ اس شخص کی بیٹی جو آپ کے گھر میں زخمی حالت میں موجود ہیں۔ خدا کے لیے ان کی ہدایت پر عمل نہ کریں۔ یہ مجھے بے شک مار ڈالیں۔ میرے بابا کو بچا لیں۔ وہ کوئی ایسی بات جانتے ہیں، جو ان سب کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی ہے۔ خدا جانے وہ کیا بات ہے۔ جب کہ میں کچھ نہیں جانتی۔ لہذا میرے مرنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ یہی نا کہ بابا دو چار دن روتے رہیں گے، لیکن آخر انہیں صبر آ جائے گا۔"

ان الفاظ کے ساتھ ہی لڑکی کی آواز کا گلا گھٹ گیا۔ شاید ریسیور اس کے ہاتھ سے چھین لیا گیا تھا۔

"تم لڑکی کی آواز سن چکیں۔" دوسری طرف سے غرا کر کہا گیا۔

"ہاں! سن چکی۔"

"پھر تم نے کیا فیصلہ کیا۔"

"تم نے مجھے ایک منٹ کی مہلت سوچنے کے لیے دی تھی جب کہ اس دوران ہم باتیں کرتے رہے ہیں، سوچنے کی مہلت نہیں مل سکی۔ لہذا ایک منٹ سوچنے کے لیے دو۔" انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"اچھی بات ہے۔ ریسیور اسی طرح رہنے دو۔ ایک منٹ بعد ہمیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ریسیور میز پر رکھ دیا۔ پھر ایک ایک قدم اٹھاتی ہوئی نقاب پوش کے قریب آئیں اور مدھم آواز میں بولیں:

"تم میرا نشانہ دیکھ ہی چکے ہو۔ اب ایک منٹ بعد میں فون میں تمہارے ساتھیوں سے کہوں گی کہ میں سوچ چکی ہوں اور پستول تمہارے ساتھی کے حوالے کر رہی ہوں، تم اس سے پوچھ لو... یہ کہہ کر میں ریسیور تمہارے ہاتھ میں دے دوں گی، لیکن پستول نہیں دوں گی۔" یہ کہتے وقت بیگم جمشید شوخ انداز میں مسکرا اٹھیں۔

"کیا مطلب؟" اس کے منہ سے مارے حیرت کے نکلا۔

"آہستہ آواز میں بات کرو۔ تم ان سے یہی کہو گے کہ تم پستول حاصل کر چکے ہو، لیکن پستول تمہاری کنپٹی سے صرف ایک انچ کے فاصلے پر ہوگا اور اگر تم نے فون میں یہ الفاظ نہ کہے تو میں ایک رتی بھی لحاظ نہیں کروں گی۔ فوراً گولی مار دوں گی، پھر چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

نقاب پوش ساکت رہ گیا۔ بیگم جمشید اپنی ذہانت سے کام لے کر ان پر بازی لے گئی تھیں۔ ٹھیک ایک منٹ بعد انہوں

نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔

"ہاں! ہم اس طرف موجود ہیں، تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟"

"میں ریسیور اور پستول تمہارے ساتھی کو دے رہی ہوں۔" انہوں نے ہارے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بہت خوب! ہمیں یہی امید تھی۔ تو پھر جلدی کرو۔"

انہوں نے نقاب پوش کو اشارہ کیا کہ آگے بڑھ کر ریسیور لے لے۔ ساتھ ہی انہوں نے بایاں ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا، دایاں ہاتھ اس سے کافی فاصلے پر تھا اور نقاب پوش پستول پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس نے ریسیور پکڑا اور بیگم جمشید جلدی سے اس کے پیچھے آکھڑی ہوئیں اور نالی کا رخ اس کی کنپٹی کی طرف کر دیا۔

"ہیلو... میں گرڈی بول رہا ہوں۔ میں نے پستول اپنے قبضے میں کر لیا ہے۔" اس نے ریسیور میں کہا۔

"بہت خوب! اب تم جلد از جلد اپنا کام ختم کر کے ہم تک پہنچ جاؤ۔"

"اچھی بات ہے۔"

دوسری طرف سے فون کا ریسیور رکھنے کی آواز سن کر اس نے بھی فون بند کر دیا اور بیگم جمشید کی طرف مڑا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"اب تم مجھے بتاؤ گے کہ تم لوگوں نے کہاں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ تاکہ میں وہاں جا کر اس معصوم بچی کو چھڑا لاؤں۔"

"تم چھڑا کر لاؤ گی۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں! شاید آج یہ سب کام مجھے ہی کرنے پڑیں گے۔" ان کے منہ سے نکلا۔

"کیا مطلب؟... کیا اس سے پہلے بھی اس قسم کے کام تمہارے گھر کے دوسرے افراد کرتے رہتے ہیں؟" نقاب پوش نے چونک کر کہا۔

اور اس وقت بیگم جمشید کو یہ احساس ہوا کہ دشمنوں کو ان کے گھرانے کے بارے میں بالکل کچھ معلوم نہیں۔ وہ سوچ میں پڑ گئیں... آخر انہوں نے پھر کہا:

"تم نے بتایا نہیں؟"

"انہوں نے یہاں سے بہت دور ایک مکان میں ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ مکان کے مالکان کسی شادی کی تقریب میں گئے ہوئے ہیں۔ تم وہاں تک نہیں جا سکو گی۔"

"اوہ... اچھا خیر... تم پھر سے دیوار کی طرف مڑ کر کھڑے ہو جاؤ، ہاتھ سر سے بلند کر لو۔ اگر کوئی حرکت کی تو میں گولی چلانے سے پہلے کچھ سوچوں گی نہیں۔"

اس نے اپنا منہ دیوار کی طرف کر کے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔

بیگم جمشید دبے پاؤں اس کی طرف بڑھنے لگیں۔ انہوں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ اس شخص سے تھوڑی دیر کے لیے پیچھا چھڑائے بغیر کوئی کام نہیں بنے گا۔

اور پھر وہ اس کے بالکل نزدیک پہنچ گئیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بلند کیا، عین اسی وقت نقاب پوش کو خطرے کا احساس ہوا، وہ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا، لیکن اتنی دیر اس کے سر پر ہاتھ پڑ چکا تھا، البتہ اس کے مڑنے کی وجہ سے ہاتھ اوچھا پڑا، وہ لڑکھڑایا ضرور لیکن پھر سنبھل گیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے بیگم جمشید کا پستول والا ہاتھ کلائی پر سے تھام کر اوپر اٹھا دیا...

یہ موقع اسے اس لیے ملا تھا کہ پستول کا دستہ اس کے سر پر مارنے کے لیے بیگم جمشید کو پستول نالی کی طرف سے پکڑنا پڑا تھا۔ پستول اس وقت بھی نالی کی طرف سے ہی پکڑا ہوا تھا۔

اسی وقت اس کا دوسرا ہاتھ پستول اچکنے کے لیے اٹھا، بیگم جمشید نے بھی عین اسی وقت اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ اور ایک زوردار جھٹکا مارا۔ دونوں کی ٹانگیں الجھ گئیں اور وہ دھڑام سے گر پڑے۔ پستول بیگم جمشید کے ہاتھ سے نکل کر گرا اور فرش پر دور تک گھسٹتا چلا گیا۔ بیگم جمشید سے پہلے وہ اٹھ کھڑا ہوا، اس نے پستول کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

لیکن پستول تو نہ جانے کون سے کونے میں جا گھسا تھا، نقاب پوش جھنجھلا گیا، وہ بجلی کی سی تیزی سے زخمی کی طرف بڑھا اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر رکھ کر دباؤ ڈالنے لگا۔ اس نے سوچا تھا۔ اگر پستول نہیں ملتا تو وہ اپنے شکار کو گلا گھونٹ کر تو مار ہی سکتا ہے۔

زخمی کی آنکھیں کھل گئیں، ان میں خوف اور دہشت کے ساتھ ساتھ تکلیف کے آثار بھی جھلک اُٹھے۔ وہ باہر کو نکلنے لگیں۔

پُراسرار گھنٹیاں

انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ گھر سے نکل کر مختلف سمتوں میں روانہ ہوتے تھے، وہ دُور تک چلے گئے، راستے میں انہیں پولیس پارٹیاں بھی ملیں، لیکن نسیمہ کا کہیں پتا نہ چلا، آخر کوئی ایک گھنٹے بعد وہ مایوس ہو کر واپس لوٹے۔ سب سے پہلے فرزانہ گھر کے دروازے پر پہنچی۔ دروازے کے پاس اسے ایک چمکتی ہوئی چیز پڑی نظر آئی۔ چاند سر اُبھار چکا تھا، اس لیے وہ چیز اسے نظر آ گئی تھی۔ وہ اسے اُٹھانے کے لیے جھکی اور پھر ٹھٹھک گئی۔

یہ وہی گھنٹی تھی جو فاروق بلّی کے گلے میں باندھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے سوچا یہ گھنٹی یہاں کہاں سے آئی۔ پھر یاد آیا، پائیں باغ سے فاروق گھر کے اندر داخل ہوا تھا اور وہ لوگ دروازے میں سے گھر کے اندر لے گئے تھے۔ یہ گھنٹی ضرور اس وقت گری ہوگی۔ اس نے بے خیالی میں گھنٹی اُٹھانے کے لیے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا، لیکن اس نے دیکھا، گھنٹی میں

اب وہ رسّی نہیں ہے جو تھوڑی دیر پہلے اس میں موجود تھی۔ اسے کچھ حیرت ہوئی۔ اس نے گھنٹی کے اُبھرے ہوئے سرے کو پکڑ کر اُٹھا لیا اور پھر جیب میں سے رومال نکال کر اس میں رکھ کر رومال کے چاروں سروں کو پکڑ لیا۔ اس کے بعد اس نے دروازے پر دستک دی۔

دستک کے جواب میں کوئی دروازے پر نہ آیا تو اسے بڑی حیرت ہوئی، اس نے جلدی سے دوبارہ گھنٹی بجائی۔ ساتھ ہی اس کی پریشانی بڑھ گئی۔ وہ تیزی سے پائیں باغ میں کھلنے والی کھڑکی کے پاس آئی، لیکن وہ اندر سے بند تھی۔ اب تو فرزانہ گھبرائی کہ نہ جانے اندر کیا بات ہے۔ پھر واپس دروازے پر آئی اور تیسری مرتبہ گھنٹی بجائی۔ آخر اس نے سوچا... اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ بیگم شیرازی کے ہاں جا کر وہاں سے فون کر کے دیکھے۔ لیکن ظاہر ہے، اس سے بھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا... لیکن کچھ نہ کرنے سے کرنا بہتر تھا، وہ مڑی ہی تھی کہ محمود آتا نظر آیا۔

"خیر تو ہے تمہارے منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔"

"گھنٹی کے جواب میں امی جان نے دروازہ نہیں کھولا۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا۔

"اور اب میں بیگم شیرازی کے ہاں جا رہی ہوں۔" اس نے کہا۔

"اس سے کیا ہو گا؟" محمود بولا۔

"فون کر کے دیکھوں گی۔"

"کیوں نہ ہم پائیں باغ کے کسی درخت کو آزمائیں۔"

"درخت کی کوئی شاخ چھت تک نہیں جاتی، یہ بات ہمیں پہلے ہی معلوم ہے۔"

"تو پھر بیگم شیرازی کے مکان کی چھت کے ذریعے بھی ہم اپنی چھت پر نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ درمیانی دیوار بہت اُونچی ہے اور اُن کی چھت پر لکڑی کی کوئی سیڑھی بھی نہیں۔"

"لہذا اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ ہم آنٹی بیگم شیرازی کے ہاں جا کر امی جان کو فون کریں۔"

"اگر وہ فون سننے کے قابل ہیں تو پھر دروازہ بھی کھول سکتی ہیں۔" محمود نے کہا۔

"نہیں... دونوں صورتوں میں فرق ہے۔" فرزانہ بولی۔

"تو پھر چلو۔ کیا ابھی تک فاروق نہیں لوٹا؟"

"لوٹ گیا ہوں اور نہایت خاموشی سے تمہاری میٹنگ سن رہا تھا۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارا نہیں کہ آنٹی کے گھر جا کر کچھ کریں۔" فاروق نے تاریک گوشے میں سے نکلتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں کتنی دیر سے ہو؟" فرزانہ نے جل کر پوچھا۔

"میں نے یہاں آنے کے فوراً بعد ٹائم نہیں دیکھا تھا، ورنہ تمہارے سوال کا جواب ضرور دیتا۔" فاروق نے کہا۔

"اچھا یہ وقت بے کار کی باتوں کا نہیں ہے۔ ہمیں اندر پہنچنا ہے۔ آؤ بیگم شیرازی کے ہاں چلیں۔"

وہ جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ دروازے پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ چونک اُٹھے... خدا جانے کون دروازہ کھولنے آ رہا تھا۔ وہ حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے، لیکن ابھی دروازہ کھلا نہیں تھا کہ انہوں نے موٹر سائیکل کی آواز سنی اور وہ گھبرا گئے، کیونکہ عین اسی وقت دروازہ کھلا تھا جب ان کے والد دروازے کے بالکل سامنے پہنچے تھے، جب کہ وہ پائیں باغ کے دروازے میں چھپ چکے تھے۔

○

بیگم جمشید نے اُٹھنے سے پہلے دیکھا کہ حملہ آور زخمی کا گلا دبوچ چکا ہے، وہ طیش میں آ گئیں۔ ان کے ہوتے ہوئے، ان کے مہمان کی زندگی ختم کی جا رہی تھی؛ ایک غریب آدمی موت کے گھاٹ اتارا جا رہا تھا۔ انہوں نے لیٹے لیٹے بجلی کی سی تیزی سے نظریں اِدھر اُدھر دوڑائیں اور پھر اچانک انہیں پستول نظر آ گیا۔ وہ الماری کے نیچے چلا گیا تھا۔ لیٹے لیٹے وہ الماری کی طرف رینگ

گئیں، دوسرے ہی لمحے پستول ایک بار پھر ان کے ہاتھ میں آ گیا، انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پستول کا رُخ حملہ آور کی طرف کر کے فائر کر دیا، کیونکہ اب وہ زخمی کی زندگی بچانے کے لیے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

پستول بے آواز تھا۔ اس میں سے نکلنے والی گولی حملہ آور کی دائیں ران میں لگی، اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور فوراً ہی اس کے ہاتھ زخمی کے گلے سے ہٹ کر اپنی ران پر آ گئے۔ آہستہ آہستہ وہ بیٹھتا چلا گیا۔

"گولی تمہارے سینے کے پار بھی ہو سکتی تھی، لیکن میں نے جان بوجھ کر تمہاری ران کا نشانہ لیا تھا، کیونکہ میں کسی کو جان سے مارنا پسند نہیں کرتی۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا مجرم کیوں نہ ہو۔ میرے نزدیک وہ انسان پہلے ہے۔ اب اگر تم نے اس شخص کی طرف ہاتھ بڑھایا تو میں تمہاری دوسری ٹانگ میں بھی گولی مار دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئیں۔ گرڈی کی ٹانگ سے خون نکل نکل کر فرش پر بہنے لگا۔ وہ کراہنے اور سسکنے لگا۔ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ بیگم جمشید چونک اُٹھیں۔ گھنٹی بجانے کا انداز نرالا تھا۔ انہوں نے ایک نظر گرڈی پر ڈالی۔ گرڈی ابھی ہوش میں تھا اور خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ سوچنے لگیں کہ کیا کریں آخر انہوں نے پستول کو نالی کی طرف سے پکڑا اور گرڈی کی طرف بڑھنے لگیں،

وہ ان کے ارادے کو تاڑ گیا، گڑگڑا کر بولا:

"نہیں نہیں... مجھے نہ مارنا۔"

"تو پھر کسے ماروں... کیا اس شخص کو ماروں جسے تم جان سے مارنے کی ٹھان بیٹھے ہو۔ میرا دروازے پر جانا بہت ضروری ہے۔"

اسی وقت گھنٹی پھر بجی۔ بیگم جمشید چونک اٹھیں، ان کی نظر چوک گئی اور گرڈی کو موقع مل گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نہایت پھرتی سے ان کی ٹانگ گھسیٹ لی، وہ گر گئیں اور پستول ان کے ہاتھ سے ایک مرتبہ پھر نکل گیا، اور نئی مصیبت یہ ٹوٹی کہ گرنے کے باوجود ٹانگ گرڈی کے ہاتھ میں ہی رہی۔

وہ ان کی ٹانگ کو مروڑنے لگا۔ بیگم جمشید فرش پر لڑھکنیاں کھانے لگیں۔ ساتھ ساتھ ان کے منہ سے تکلیف کی وجہ سے دبی دبی چیخیں نکل رہی تھیں، لیکن وہ آوازوں کو بلند نہیں ہونے دے رہی تھیں، تاکہ فرزانہ پریشان نہ ہو جائے.... اور کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھے... پلٹنیاں کھاتے ہوئے انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کا عمل جاری رکھا۔ انہوں نے ٹانگ چھڑانے کی بھی پوری کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہوئیں، اس نے کچھ ایسی مضبوطی سے ٹانگ کو جکڑ رکھا تھا، لیکن پھر اس کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ شاید تیزی سے بہتے والے خون نے کمزوری پیدا کر دی تھی اور آخر وہ وقت بھی آ پہنچا جب انہوں نے ایک جھٹکا مار کر ٹانگ چھڑا لی۔ انہوں نے جلدی سے اٹھ کر پستول اٹھایا، ایک دستہ گرڈی کی کنپٹی پر زور سے رسید

کیا اور وہ ایک جھرجھری سی لے کر بے ہوش ہو گیا، انہوں نے اسے ہلا جلا کر دیکھا اور پھر یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ وہ واقعی بے ہوش ہو گیا، دروازے کی طرف لپکیں۔ جونہی انہوں نے دروازہ کھولا، وہ حیران رہ گئیں۔ وہاں انسپکٹر جمشید کھڑے تھے:

"ارے آپ ہیں، لیکن گھنٹی بجانے کا انداز تو فرزانہ کا تھا!" ان کے منہ سے نکلا۔

"میں خود حیران ہوا تھا کہ گھنٹی بجائے بغیر تم نے آ کر دروازہ کس طرح کھول دیا۔ اس کا مطلب ہے، وہ یہیں کہیں دبکے ہوئے ہیں۔ چلو بھئی آ جاؤ۔" انسپکٹر جمشید مسکرا کر بولے۔

تینوں تاریکی میں سے نکل کر ان کے نزدیک آ گئے۔

"امی جان! آپ نے دروازہ اتنی دیر بعد کیوں کھولا؟" فرزانہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اندر چل کر دیکھ لو، نسیمہ نہیں ملی؟"

"نہیں... اس کا دور دور تک کہیں پتا نہیں۔"

"لیکن میرا خیال ہے، وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔" بیگم جمشید بولیں:

"یہ تم کس طرح کہہ سکتی ہو؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہر بات کا جواب اندر چل کر ہی دے سکتی ہوں۔ ہمیں نسیم کے والد کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہیے۔" بیگم جمشید بولیں۔

"اوہ ہاں! یہ بھی ٹھیک ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

وہ اندر آئے اور کمرے کی حالت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ فرش پر پڑے گرڈی اور بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر وہ ساری بات سمجھ گئے۔ تاہم بیگم جمشید نے انہیں ہر بات تفصیل سے سنائی۔ ٹیلی فون پر جو بات چیت کی گئی تھی، اسے سن کر تو وہ اچھل ہی پڑے۔ بیگم جمشید کے خاموش ہوتے ہی محمود نے کہا:

"اس کا مطلب ہے، انہوں نے کہیں نزدیک ہی اپنے لیے کوئی ٹھکانا تلاش کر لیا ہے۔"

"اس کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔"

"لیکن ایک عجیب بات اور بھی ہے۔" بیگم جمشید نے کچھ سوچ کر کہا۔

"وہ کیا؟"

"فون کرنے والے کی باتوں سے ایسا معلوم ہوا تھا جیسے وہ ہمارے بارے میں کچھ بھی نہ جانتا ہو۔"

"اوہو... پھر اس نے فون کیسے کر ڈالا۔"

"یہی تو بات مجھے عجیب محسوس ہو رہی ہے۔" بیگم جمشید بولیں۔

"خیر! اس پہلو پر بعد میں غور کریں گے۔ فی الحال تو ہمیں گرڈی کو ہوش میں لا کر اس سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرنی ہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اسی وقت فرزانہ کو اپنے ہاتھ میں تھامی گھنٹی کا خیال آگیا۔

"فاروق تمہاری گھنٹی۔" اس نے کہا اور گھنٹی اس کی طرف بڑھا دی۔

"میری گھنٹی... کیا مطلب؟"

"یہ وہی گھنٹی ہے۔ جو تم بلی کے گلے میں باندھنے کی کوشش کر رہے تھے۔" فرزانہ بولی۔

"یہ... یہ تمہیں کہاں سے ملی؟" فاروق کے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔

"کیوں اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے۔" فرزانہ نے بھی حیران ہو کر کہا۔ انسپکٹر جمشید اور محمود بھی فاروق کو غور سے دیکھنے لگے۔

"اس لیے کہ یہ وہ گھنٹی نہیں... جو میں بلی کے گلے میں باندھ رہا تھا۔" فاروق نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"کیا کہا۔ یہ وہ گھنٹی نہیں۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ بالکل ویسی ہی گھنٹی ہے۔" فرزانہ بولی۔

"اس گھنٹی میں میں نے رسی پروئی ہوئی تھی۔"

"تو کیا ہوا... رسی نکل گئی ہو گی۔" محمود بولا۔

"نہیں! میں نے وہ گھنٹی اپنی جیب میں رکھ لی تھی اور وہ اب تک میری جیب میں موجود ہے۔" فاروق کا لہجہ حد درجے عجیب

تھا جیسے وہ خود اپنے لہجے پر حیران ہو۔

"کیا کہا... تمہاری جیب میں موجود ہے؟" فرزانہ کے منہ سے نکلا۔

"ہاں! لو میں دکھاتا ہوں۔" یہ کہہ کر فاروق نے جیب میں ہاتھ ڈال دیا، لیکن اس کی جیب میں تو نہ جانے کیا کیا الا بلا بھری پڑی تھی کہ فوری طور پر گھنٹی اس کے ہاتھ نہ لگ سکی۔ انسپکٹر جمشید نے اس وقت تک گھنٹی کے بارے میں بات چیت پر کوئی توجہ نہیں دی تھی، ان کا ذہن تو زخمی اور اس کی بیٹی میں اٹکا ہوا تھا، لیکن جب گھنٹیاں ایک کی بجائے دو ہو گئیں تو وہ بھی فاروق کی طرف دیکھنے لگے۔

"تم جیب میں سے گھنٹی تلاش کر رہے ہو یا قارون کا خزانہ؟" محمود نے جل کر کہا۔

"کتنی بے تکی بات کہی... بھلا قارون کا خزانہ کہیں جیب میں بھی سما سکتا ہے اور وہ بھی فاروق کی جیب میں؟" فرزانہ نے منہ بنا کر کہا۔

"اور کیا۔ قارون کا خزانہ اگر آ سکتا ہے تو کم از کم فرزانہ کی جیب میں آ سکتا ہے؟" فاروق نے جل کر کہا۔

"آخر تم جیبوں میں کیا کچھ ڈالے رہتے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے بھی اسے گھورا۔

"جی۔ کام کی چیزیں... جو آڑے وقت کام آتی ہیں اور ہمیں

بڑی بڑی پریشانیوں سے منٹوں میں صاف بچا لے جاتی ہیں۔"

"کئی منٹ تو تم کام کی چیز تلاش کرنے میں ہی لگا دیتے ہو۔ تو پھر یہ چیزیں منٹوں میں کس طرح کام آتی ہوں گی؟"

"یہ تو اس وقت معاملہ کچھ اٹک گیا ہے۔ نہ جانے گھنٹی جیب کے کس کونے میں جا گھسی ہے؟"

"تمہاری جیب ہے یا شیطان کی آنت... آخر اس کے کتنے کونے ہیں؟" محمود نے بھی تلملا کر کہا۔

"میں نے آج تک گنے نہیں... اب تم نے پوچھا ہے تو ضرور گنوں گا۔" فاروق مسکرایا۔

"یار اب نکال بھی چکو..." انسپکٹر جمشید جھلا اٹھے۔

"بہت بہتر ابا جان... میں اپنی پوری جیب ہی میز پر الٹے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے واقعی جیب الٹ دی اور یہ دیکھ کر محمود اور فرزانہ کا مارے غصے کے برا حال ہو گیا کہ اس کی جیب میں سے صرف گھنٹی میز پر گری تھی اور اس کے ساتھ رسی بھی موجود تھی۔

"یہ کیا... جیب کی باقی چیزیں کہاں گئیں؟" فرزانہ پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔

"باقی چیزیں میں نے جادو کے زور سے اندر ہی روک دی

ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"یونہی اتنا وقت برباد کیا، اس وقت میں ہم کوئی کام کی بات سوچ سکتے تھے۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"ہم وقت کو ہمیشہ ہی آباد کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وقت بے چارہ بھی کیا سوچتا ہوگا۔ کبھی کبھی تو اس کا جی بھی برباد ہونے کو چاہتا ہوگا، لہٰذا اس وقت میں نے یہی سوچ کر برباد کیا ہے۔"

"تم اپنا وقت بڑے شوق سے برباد کر سکتے ہو، لیکن ہمارے وقت کو برباد کرنے کی اجازت تمہیں ہرگز نہیں دی جائے گی۔" محمود نے گویا اسے دھمکی دی۔

"میرا خیال ہے۔ اب تم تینوں مزید وقت برباد کر رہے ہو۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے پھر بولے:

"گھنٹیوں کا معاملہ کچھ عجیب سا ہے۔ اس وقت دونوں گھنٹیاں میز پر موجود ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں... سوائے اس کے کہ ایک میں رسی پروئی ہوئی ہے۔"

"یہ رسی تو میں نے پروئی تھی۔" فاروق بولا۔

"بس تو پھر... اس کا مطلب ہے دونوں گھنٹیوں میں کوئی فرق نہیں... فرزانہ تمہیں گھنٹی کہاں سے ملی؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے دروازے کے باہر... چاند کی روشنی میں چمک رہی تھی۔"

"اور فاروق... تمہیں گھنٹی کہاں سے ملی تھی؟"

"پائیں باغ سے، کھڑکی کے نیچے پڑی تھی۔"

"حیرت ہے۔ ہمارے گھر کے آس پاس دو دو گھنٹیاں کہاں سے آگئیں۔ گھنگرو سے ذرا بڑی ہیں۔ اور شاید پیتل یا کانسی کی بنی ہوئی ہیں۔"

یہ کہتے وقت انہوں نے دونوں گھنٹیوں کو اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا اور بغور دیکھنے لگے، پھر انہیں ہلا کر بھی دیکھا۔ اس میں سے کھنک دار آواز ابھری۔

"ان گھنٹیوں نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔"

"جی... کیا مطلب... اب یہ ننھی منی گھنٹیاں بھی ہمیں پریشان کریں گی۔" محمود کے لہجے میں حیرت تھی۔

"خیر... ان کے بارے میں ہم دن نکلنے کے بعد سوچیں گے۔ اب سب سے پہلے ہمیں اس حملہ آور کو باندھنا ہے، اس کے زخم پر پٹی کرنی ہے اور پھر ہوش میں آنے کے بعد اس سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اس کے باقی ساتھی کہاں پناہ لیے بیٹھے ہیں تاکہ ان سے اس غریب نجومی کی بیٹی کو چھڑایا جا سکے اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ چکر کیا ہے۔ کیوں یہ لوگ اس کی جان لینے پر تلے ہیں۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

چند منٹ بعد وہ گرڈی کو ہوش میں لا چکے تھے۔ اور وہ

ان سب کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"تو تمہارا نام گرڈش ہے۔"

"ہاں!" اس کے منہ سے نکلا۔

"تمہارے باقی ساتھی کہاں ٹھکانہ بنائے بیٹھے ہیں؟"

"میں نہیں جانتا۔"

"یعنی تم بتانا نہیں چاہتے۔"

"ہاں! نہیں بتاؤں گا۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

"تم اس شخص کی جان کیوں لینا چاہتے ہو؟"

"یہ بات بھی مجھے معلوم نہیں۔" اس نے کہا۔

"معلوم نہیں یا بتانا نہیں چاہتے۔"

"معلوم نہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے، کسی اور کے حکم پر یہ کام کر رہے ہو۔"

"ہاں! یہی سمجھ لو۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"وہ کون ہے؟"

"میں نہیں بتا سکتا۔"

"اچھی بات ہے۔ اب اپنے برے انجام کا انتظار کرو... میں چاہوں تو زبردستی تم سے اگلوا سکتا ہوں، لیکن اس طرح وقت ضائع ہوگا..."

"لیکن ابا جان! اب ہم ان لوگوں کے ٹھکانے کے بارے میں

معلوم کر بھی کس طرح سکتے ہیں۔"

"سب سے پہلے ہمیں اس زخمی کو ہوش میں لانا ہوگا... یہ بات تو یہی بتا سکتا ہے کہ کچھ لوگ اسے کیوں ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔"

"اوہ ہاں! ٹھیک ہے۔" محمود کے منہ سے نکلا۔

عین اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

دشمنوں کا ٹھکانا

انسپکٹر جمشید نے فون کا ریسیور اُٹھایا تو دوسری طرف سے فوراً ہی کسی نے کہا:

"ہیلو گرڈی... تم اب تک واپس کیوں نہیں؟"

"میرا نام گرڈی نہیں... البتہ اس نام کا ایک شخص یہاں موجود ضرور ہے جو ہمارے قبضے میں ہے۔ اب تم کہو کیا کہنا چاہتے ہو، گرڈی اس لیے واپس تم تک نہیں پہنچ کہ وہ اپنا کام نہیں کر سکا۔ زخمی شخص ابھی تک زندہ سلامت موجود ہے، اس سے پہلے تم نے پیش کش کی تھی کہ پستول گرڈی کو دے دیا جائے تاکہ وہ زخمی آدمی کو ہلاک کر سکے اور اس کے بدلے میں تم اس شخص کی بیٹی کو ہلاک نہیں کرو گے جو تمہارے قبضے میں ہے، لیکن اب صورتحال بدل چکی ہے، اب تمہارا ساتھی ہمارے رحم و کرم پر ہے اور ہم اسے صرف اس شرط پر چھوڑ سکتے ہیں کہ تم زخمی آدمی کی بیٹی کو چھوڑ دو۔ وہ یہاں پہنچ جائے گی تو ہم تمہارے ساتھی کو آزاد کر دیں گے۔"

انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

"تم کون ہو؟" دوسری طرف سے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کہا گیا۔

"اس مکان کا مالک!"

"تو سنو... ہم اس لڑکی کو نہیں چھوڑ سکتے... زخمی آدمی جب ہوش میں آ جائے گا، ہم اس سے بات کریں گے۔ اگر اس نے ہماری ایک شرط مان لی تو ہم اس کی بیٹی کو رہا کر دیں گے، اس کے ساتھ ہی ہمارے ساتھی کو آزاد کرنا ہو گا۔"

"اچھی بات ہے... تم کہاں سے اور کس نمبر سے بول رہے ہو؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ نہیں بتایا جا سکتا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"یہ تو ظاہر ہے کہ تم لوگ یہاں نزدیک ہی کہیں موجود ہو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ہم تمہاری پہنچ سے بہت دور ہیں۔" جواب ملا۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی زخمی بے ہوش ہے۔ تم کچھ دیر ٹھہر کر فون کرنا۔"

"بہت اچھا۔" یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا گیا۔

"معاملہ اُلجھ گیا ہے۔" انسپکٹر جمشید ان کی طرف مڑے۔ "جب تک یہ ہوش میں نہیں آ جاتا، کچھ معلوم نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن ابا جان! ہم ایک اہم بات بھول رہے ہیں۔ آخر ان

لوگوں کو ہمارا فون نمبر کس نے بتایا ؟"

"اس نے جس کے گھر پر انہوں نے قبضہ کر رکھا ہے ظاہر ہے انہوں نے گھر کے لوگوں کو پستول کی زد پر لے رکھا ہوگا اور دھمکی دے کر ہمارا فون نمبر معلوم کیا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید کی بجائے فاروق نے خیال ظاہر کیا۔

"یہی تو دلچسپ ترین بات ہے۔ ہمارے گھر میں تو فون ابھی چند دن پہلے لگا ہے۔ ابھی موجودہ ڈائریکٹری میں اس کا نمبر بھی نہیں ہے۔ پھر وہ کون ہے، جسے ہمارا نمبر معلوم ہے۔" محمود پُرجوش لہجے میں بولا۔

"اوہ!" وہ چونکے۔

"تم کیا کہنا چاہتے ہو؟" فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

"کیا تم ابھی تک نہیں سمجھیں؟" محمود مسکرایا۔

"نہیں... کیونکہ ہمارے نمبر سے ہمارے پڑوسیوں میں سے صرف ایک شخص واقف ہے اور وہ بیگم شیرازی ہیں، ہم نے اپنا نمبر ابھی تک صرف انہیں بتایا ہے۔ اس لیے کہ جو کوئی بھی ان کے ذریعے ہمیں فون کرے، وہ انہیں بتا دیں کہ ہمارے ہاں فون لگ چکا ہے اور نمبر یہ ہے۔"

"تو... تو... کیا ان لوگوں نے بیگم شیرازی کے گھر پر قبضہ جما رکھا ہے۔" فاروق نے مارے حیرت کے کہا۔

"اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔" محمود بولا۔

"پھر تو میدان مار لیا، اب ہم ان لوگوں کو اپنے قبضے میں لے سکتے ہیں۔" فاروق خوش ہو کر بولا۔

"میں بہت دیر پہلے اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ دشمنوں نے بیگم شیرازی کے گھر پناہ لے رکھی ہے۔"

"تو پھر آپ نے ہمیں بتایا کیوں نہیں اور ان لوگوں کو گرفتار کرنے کے لیے قدم کیوں نہ اٹھایا۔" فرزانہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں سوچتا رہا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ معاملہ اتنا آسان نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو، بیگم شیرازی کی زندگی خطرے میں ہے۔ انہوں نے انہیں پستول کی زد پر لے رکھا ہوگا۔ اگر ہم نے مکان میں داخل ہونے کی کوشش کی تو وہ دھمکی دیں گے کہ اس صورت میں بیگم شیرازی کو گولی مار دیں گے۔ اور ہم اُلجھن میں پڑ جائیں گے۔"

"تو کیا بیگم شیرازی نے ان لوگوں کو آپ کا نام بھی بتا دیا ہوگا۔" بیگم جمشید نے سوال کیا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے، انہوں نے میرا نام جمشید احمد بتایا ہوگا اور اس شہر میں نہ جانے کتنے جمشید احمد ہوں گے، ان کے لیے چونکنے والی بات تو اس وقت تھی جب وہ انہیں میرے بارے میں مکمل طور پر بتاتیں، لیکن میں جانتا ہوں، انہوں نے ایسا

نہیں کیا ہو گا۔ اور اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم انہیں کس طرح بچا سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے۔

چاروں سوچ میں ڈوب گئے۔ آخر انسپکٹر جمشید بولے:

"فاروق! تم سٹور روم میں جاؤ، وہاں کپڑوں والے حصے میں ایک پوسٹ مین کی وردی موجود ہے... وہ لے آؤ۔"

"آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"میں بیگم شیرازی کے لیے تار لے کر جاؤں گا۔"

"اوہ! لیکن کیا وہ دروازہ کھول دیں گے؟" محمود نے سوال کیا۔

"ہاں! انہیں دستخط کرنے کے لیے دروازہ کھولنا ہی پڑے گا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"بہت خوب! ترکیب زور دار ہے۔" فرزانہ نے کہا اور فاروق وردی لینے چلا گیا۔

پانچ منٹ بعد انسپکٹر جمشید اچھے بھلے پوسٹ مین نظر آ رہے تھے۔ ان کے کندھے سے ایک تھیلا بھی لٹک رہا تھا۔ جس کے منہ پر تار فارموں کے سرے نظر آ رہے تھے اور کان پر ایک بال پوائنٹ پنسل ٹکی تھی۔

"ابا جان! آپ تو سچ مچ کے ڈاکیے نظر آ رہے ہیں۔" فاروق مسکرایا۔

"ہاں! اس کے بغیر وہ دروازہ نہیں کھولیں گے۔" انہوں نے کہا۔

"کیا ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے؟"

"ہرگز نہیں... انہیں شک ہو جائے گا، البتہ چند منٹ بعد تم ضرور بیگم شیرازی کے دروازے پر آ کر جائزہ لے لینا۔" انہوں نے کہا اور پھر بولے:

"اب مجھے ایک موٹی سی کاپی بھی دے دو۔"

"کیوں! کاپی کا کیا کریں گے؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اس پر دستخط لوں گا۔"

"لیکن اس کے لیے کاپی کا موٹا ہونا کیا ضروری ہے؟" فاروق نے پوچھا۔

"ہاں! بہت ضروری ہے۔"

"ذرا ہمیں بھی تو بتا دیں، کس طرح ضروری ہے؟"

"یہ میں بعد میں تم سے پوچھوں گا۔ یوں لگتا ہے جیسے تم نے عقل سے کام لینا بند کر دیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے برا سا منہ بنایا۔

"جی نہیں تو... کام تو ہم عقل سے ہی لیتے ہیں، لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایک عقل تین تین کے حصے میں آتی ہی کیا ہے۔" فاروق نے مسمسی صورت بنا کر کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر جمشید نے فاروق کو گھورا۔

"جی مطلب یہ کہ ہم تینوں صرف فرزانہ کی عقل سے کام نکالنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس طرح ہر ایک کے حصے

ہیں اس کی عقل کا ایک بٹا تین حصہ آتا ہے۔" فاروق نے نئی کہی۔

"تو یہ ہے۔ ان حالات میں تو وقت ضائع کرنے کا پروگرام نہ بناؤ۔" محمود نے جھلا کر کہا۔

"بہت اچھا، نہیں بناتا۔ ٹھہریے ابا جان! میں آپ کو کاپی لا دیتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد انسپکٹر جمشید ایک ڈاکیے کے روپ میں گھر سے نکل کر بیگم شیرازی کے دروازے کی طرف جا رہے تھے اور وہ چاروں اپنے دروازے کو اندر سے بند کر کے چھت کا رخ کر رہے تھے۔

وہ چھت کی منڈیر سے یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ کس طرح بیگم شیرازی کے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ داخل ہونے میں کامیاب بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔ جونہی وہ اوپر پہنچے انہوں نے دروازے پر دستک کی آواز سنی، ان کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ پھر کسی نے بیگم شیرازی کے گھر کے اندر سے پوچھا:

"کون ہے؟"

اور انہیں یقین ہو گیا کہ دشمنوں نے اسی گھر پر قبضہ جما رکھا ہے، کیوں کہ یہ وہی آواز تھی جو وہ اب تک فون پر سنتے رہے تھے۔

"تار والا... بیگم شیرازی کے نام تار ہے۔"

"اوہ... اچھا... تار اندر سرکا دو۔" اندر سے کہا گیا۔

"تار تو میں اندر سرکا دوں گا... لیکن کاپی پر دستخط بھی تو لینے ہوں گے۔" انسپکٹر جمشید کی آواز سنائی دی۔

"تو پھر کاپی بھی دروازے کے نیچے سے اندر سرکا دو۔" اندر سے کہا گیا۔

"بہت بہتر۔" یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید پنجوں کے بل بیٹھ گئے اور کاپی اندر سرکانے کی کوشش کی۔ لیکن کاپی تو بہت موٹی تھی۔ انہوں نے سنا، وہ کہہ رہے تھے۔

"کاپی کی موٹائی زیادہ ہے۔ آپ کو دروازہ ہی کھولنا پڑے گا۔"

"اوہ! اندر سے کسی کے منہ سے نکلا۔

اور اس وقت انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے والد نے فاروق کو موٹی سی کاپی لانے کو کیوں کہا تھا۔ جلد ہی دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر انسپکٹر جمشید اندر داخل ہوتے نظر آئے۔

○

"کیا بات ہے، تم اندر کیوں گھسے آ رہے ہو؟" دروازے کے

اندر موجود ایک لمبے تڑنگے آدمی نے کہا۔ اس کے چہرے پر ناگواری تھی۔

"اس سے پہلے تو مجھے کبھی اندر آنے سے نہیں روکا گیا، پھر آج کیا بات ہے، کیا بیگم صاحبہ موجود نہیں ہیں؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"وہ موجود ہیں، لیکن تم تار باہر کھڑے ہو کر بھی دے سکتے تھے۔" اس نے کہا۔

"اس سے پہلے جب بھی میں کوئی تار لے کر آیا، بیگم صاحبہ نے خود ہی آواز دے کر کہا کہ اندر چلے آؤ... لہٰذا میں آج بھی اندر چلا آیا۔ بات کیا ہے۔ بیگم صاحبہ تو اکیلی رہتی ہیں..... آپ لوگ کون ہیں؟"

"ہم اُن کے رشتے دار ہیں۔"

اتنی دیر میں انسپکٹر جمشید دو چار قدم اور آگے بڑھ چکے تھے اور اب پورے صحن کا جائزہ لے چکے تھے، انھوں نے دیکھا، بیگم شیرازی ایک کرسی پر سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔ اور انہیں عجیب سی نظروں سے گھور رہی تھیں، کیونکہ وہ ابھی تک انہیں پہچان نہیں پائی تھیں۔ ان کے دائیں بائیں دو آدمی اور کھڑے تھے۔ ان کے کپڑے شریفانہ تھے، لیکن چہروں پر شرافت کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ البتہ جس نے دروازہ کھولا تھا، وہ ضرور شکل صورت

سے بہت شریف آدمی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے جسم پر بہترین سوٹ تھا۔ اور کوئی غیر ملکی نظر آرہا تھا۔ یہ جملہ اسی نے کہا تھا:

"اچھا! لیکن آپ تو غیر ملکی نظر آتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیا ایک ملک کا آدمی کسی دوسرے ملک کے آدمی کا رشتے دار نہیں ہو سکتا؟" اس نے پوچھا۔

"ہو تو سکتا ہے۔ خیر... بیگم صاحبہ آپ تار وصول کر لیں اور کاپی پر دستخط کر دیں۔"

بیگم شیرازی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ انسپکٹر جمشید اُن کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ پھر انہوں نے کاپی کھول کر ان کے سامنے کر دی۔ کاپی پر لکھا تھا:

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

بیگم شیرازی نے چونک کر انہیں دیکھا اور پہچان لیا، وہ مسکرا اٹھیں.... عین اسی وقت ان کے دائیں بائیں کھڑے بدمعاشوں کی کھوپڑیوں پر بیک وقت زور دار مکے لگے، وہ ان مکوں کے لیے تیار نہیں تھے، لہٰذا لڑکھڑا گئے۔ لیکن ساتھ ہی ان کے ہاتھ جیبوں سے نکل آئے۔ ان میں پستول تھے۔ نالیوں کے رُخ ان کی طرف اُٹھ گئے، اسی وقت غیر ملکی نے کہا:

"اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو اور یہ بتاؤ تم کون ہو۔"

"ساتھ والے مکان کا مالک، میں سمجھ گیا تھا کہ تم لوگوں نے اس گھر کو اپنا اڈا بنا لیا ہے۔ اس لیے ڈاکیے کی وردی پہن کر چلا آیا۔" انہوں نے کہا۔

"تمہارے پاس ڈاکیے کی وردی کہاں سے آئی؟" غیر ملکی نے پوچھا۔

"میں کسی زمانے میں پوسٹ مین تھا۔" انہوں نے کہا۔

"سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟"

"سچ سچ ہی تو بتایا ہے کہ ساتھ والے گھر کا مالک ہوں، اگر یقین نہیں آتا تو آؤ۔ میں تمہیں وہاں لے چلتا ہوں۔ وہاں تمہارا ساتھی بھی موجود ہے اور وہ زخمی بھی... لیکن... اس کی بیٹی کہاں ہے؟" انسپکٹر جمشید نے پریشان ہو کر پوچھا، کیونکہ وہاں کوئی لڑکی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"وہ سامنے والے کمرے میں بند ہے۔"

"تو پھر تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ اسے ساتھ لے کر میرے گھر چلو، وہاں ہم مل جل کر طے کر لیں گے کہ کیا ہونا چاہیے؟"

"یہ ٹھیک رہے گا۔" غیر ملکی نے کہا۔ "لیکن تم اسی طرح ہاتھ اوپر اٹھائے رہو گے۔"

"بہت بہتر!" انہوں نے کہا۔

"اور یہ عورت بھی ہمارے ساتھ چلے گی۔" غیر ملکی نے کہا۔

"کیوں.... انہیں ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟" انسپکٹر جمشید بولے۔

"تاکہ یہ پولیس کو فون نہ کر سکے۔" اس نے کہا۔

"اوہ... یہ بھی ٹھیک ہے۔" انہوں نے کہا۔

"تم دونوں اور وہ لڑکی.... آگے آگے چلیں گے۔ ہم تمہارے پیچھے رہیں گے، اگر کسی نے کوئی حرکت کرنے کی کوشش کی تو ہم گولی چلا دیں گے، پھر چاہے کچھ ہو جائے۔"

"بھائی بار بار گولی چلانے کا ذکر نہ کرو۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے گھبرا کر کہا۔

"چلو جوجی.... لڑکی کو نکال کر لے آؤ۔" غیر ملکی نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔ وہ سامنے والے کمرے میں گیا اور ایک خوبصورت گول مٹول سی لڑکی کو نکال کر لے آیا۔ لڑکی کی آنکھوں میں بے پناہ خوف تھا۔

"کیا تم نسیمہ ہو؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی... جی ہاں۔" نسیمہ نے انہیں حیرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، شاید وہ سوچ رہی تھی کہ رات کے وقت یہ ڈاکیا کہاں سے آ گیا۔

"تو پھر آؤ... تمہارے بابا ہمارے گھر میں ہیں۔"

"اوہ!" نسیمہ کے منہ سے نکلا۔

وہ آگے پیچھے چلتے ہوئے بیگم شیرازی کے گھر سے نکل کر اُن کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔

مقابلہ ہو گیا

انسپکٹر جمشید کے اندر داخل ہونے کے بعد وہ جلدی سے چھت سے نیچے اُتر کر باہر نکل آئے تھے اور پھر انہوں نے بیگم شیرازی کے دروازے سے کان لگا کر ساری باتیں سنی تھیں، پھر جب وہ لوگ گھر سے نکلنے کی تیاریاں کرنے لگے تو وہ پیچھے ہٹ آئے تھے۔ سب سے پہلے وہ اپنے کمرے میں آئے۔

"اب کیا کرنا چاہیے۔" محمود نے کہا۔

"مقابلے کی تیاری، مورچہ بند ہو جاؤ۔" فرزانہ بولی۔

"ٹھیک ہے آؤ۔"

انہوں نے اپنے کمرے سے اپنے اپنے ہتھیار لیے اور اس کمرے میں آئے جہاں زخمی بے ہوش پڑا تھا اور فرش پر غیر ملکی کا ساتھی بندھا پڑا تھا۔ بیگم جمشید ایک کرسی پر بیٹھی تھیں انہیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ چونکیں۔

"امّی جان! وہ لوگ آ رہے ہیں۔"
"اوہ ... پھر کیا کرنا ہے؟" انھوں نے کہا۔
"آپ اسی طرح بیٹھی رہیں، ہم اس کمرے میں مختلف جگہوں پر پوزیشن سنبھال لیتے ہیں، اگرچہ دشمن صرف تین ہیں اور ان پر قابو پانا کچھ مشکل نہیں، لیکن ہمیں دشمن کو کمزور نہیں سمجھنا چاہیے اور ہر طرح تیار رہنا چاہیے۔" محمود نے کہا۔
"تمہارا خیال ٹھیک ہے، تم جلدی جلدی پوزیشن لے لو، کیا کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر آئے ہو؟"
"نہیں ... ہم بھول گئے۔" فاروق نے کہا۔
"میں دروازہ بند کر آتی ہوں۔"
"لیکن اب اس کی کیا ضرورت ہے۔" فرزانہ نے کہا۔
"تمہیں اطمینان سے پوزیشن لینے کا وقت مل جائے گا، کیونکہ گھنٹی بجنے کے بعد دروازہ کھولنے کے لیے جانا پڑتا ہے اور اس میں تقریباً ایک منٹ لگ جاتا ہے۔" بیگم جمشید مسکرائیں۔
"بہت خوب! آج تو آپ ہم سے بھی آگے نکل گئی ہیں، ابھی بے ہوش آدمی کا مقابلہ بھی آپ نے ہی کیا ہے۔" محمود نے خوش ہو کر کہا۔

"جب میں نے اس سے مقابلہ کیا تھا، اس وقت یہ بے ہوش نہیں تھا۔" بیگم جمشید جلدی سے بولیں اور وہ بے ساختہ مسکرا اُٹھے۔ پھر وہ دروازہ بند کرنے چلی گئیں۔
"بھئی ہم نے ابھی تک اس کا نقاب اُلٹ کر نہیں دیکھا، ابا جان کو بھی اس بات کا خیال نہیں آیا۔" ان کے جانے کے بعد محمود نے کہا۔
"اوہ ہاں! واقعی ہمیں اس کا نقاب اُلٹ کر دیکھنا چاہیے آخر اسے نقاب اوڑھ کر آنے کی ضرورت تھی؟"
"ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔"
یہ کہہ کر محمود نے اس کے چہرے پر منڈھا کپڑا کھینچ لیا، ان کے سامنے ایک ایسا آدمی پڑا تھا جس کے چہرے پر چیچک کے بہت گہرے نشان تھے، آنکھیں بالکل چھوٹی چھوٹی تھیں اور وہ کافی بدصورت نظر آ رہا تھا، اس بدصورتی نے اس کے چہرے کو خوفناک بنا دیا تھا۔
"شاید یہ اپنی بدصورتی کو چھپانے کے لیے نقاب اوڑھے رکھتا تھا۔" محمود نے کہا۔
"ہو سکتا ہے یہی بات ہو یا کوئی اور بات ... لیکن یہ وقت باتوں کا نہیں، کام کا ہے اور اس وقت ہمیں پوزیشن لینی ہے۔" محمود نے کہا۔

"بالکل ٹھیک! امی جان دروازہ بند کر کے آنے والی ہیں۔ ہمیں ان کے آنے سے پہلے ہی اِدھر اُدھر ہو جانا چاہیے۔"

تھوڑی دیر بعد بیگم جمشید اندر داخل ہوئیں تو انہوں نے محمود فاروق اور فرزانہ کو غائب پایا۔ انہوں نے مسکرا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور یہ اندازہ لگانے لگیں کہ تینوں کہاں کہاں چھپے ہوں گے۔ عین اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی اور وہ دروازہ کھولنے کے لیے چل پڑیں۔ جونہی انہوں نے دروازہ کھولا، اور زور سے چونکنے کی ایکٹنگ کی۔ ساتھ ہی انہوں نے آواز سنی۔

"تم بھی ہاتھ اوپر اُٹھا دو۔"

یہ کہتے ہوئے غیر ملکی ان کے سامنے آگیا۔ اب اس کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ انہوں نے ہاتھ اوپر اُٹھا دیے۔

"اس کمرے میں چلو جس میں زخمی اور ہمارا ساتھی موجود ہے۔" اس نے غرا کر کہا۔

بیگم جمشید آگے آگے چلنے لگیں، انسپکٹر جمشید، نسیمہ اور بیگم شیرازی ان کے پیچھے تھے اور ان کے بعد وہ غیر ملکی اور اس کے دونوں ساتھی، اس طرح چلتے ہوئے وہ اس کمرے میں داخل ہوئے، یہاں زخمی ابھی تک بے ہوش تھا اور مجرموں کا ساتھی فرش پر بندھا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی بند تھیں۔

"بہت خوب! آخر ہم ان تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔"

غیر ملکی نے کہا۔ "راجہ... اس شخص کو فوری طور پر ختم کر دو۔"

"بہت بہتر جناب۔ ابھی لیجیے۔" یہ کہتے ہوئے اس کا دوسرا ساتھی بے ہوش زخمی کی طرف بڑھا۔

"ٹھہرو بھئی... ایسی بھی کیا جلدی ہے!" انسپکٹر جمشید اس کے راستے میں آتے ہوئے بولے۔

"اگر تم راستے میں آئے تو تمہیں بھی نہیں چھوڑا جائے گا۔" غیر ملکی غرایا۔

"بہت اچھا! میں راستے میں نہیں آؤں گا، اس کے باوجود تم اسے ختم نہیں کر سکو گے۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تمہیں اس کی نہیں اپنی فکر کرنی چاہیے۔" غیر ملکی بولا اور ساتھ ہی اس نے کچھ اشارہ کیا۔ جوجی نے فوراً آگے بڑھ کر پستول ان کی کمر سے لگا دیا۔

"چلو راجہ... اب یہ تمہارا راستہ نہیں روک سکتا۔" غیر ملکی نے کہا۔ راجہ پھر پستول ہاتھ میں لیے آگے بڑھا۔

"نہیں نہیں۔" نسیمہ دہشت زدہ انداز میں چلائی۔

"خاموش رہو... تم اس طرح اپنے باپ کو ہوش میں نہیں لا سکتیں، نہ ہی اس کی زندگی بچا سکتی ہو۔"

"یا اللہ رحم فرما۔" نسیمہ نے چھت کی طرف منہ کر کے کہا۔

"وہ ضرور رحم فرمائے گا، کیونکہ رحم کرنا اس کی عادت ہے۔"

ایک، آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی اور اس کے ساتھ ہی کوئی چیز راجر کے دائیں ہاتھ سے زور سے ٹکرائی۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ سب نے چونک کر دیکھا، کمرے کی الماری کا دروازہ کھل گیا تھا اور راجر کے ہاتھ سے ٹکرانے والا شیشے کا پیپر ویٹ الماری میں ہی سے نکلا تھا، ساتھ ہی محمود باہر نکلتا نظر آیا۔

"اگر پیپر ویٹ زور سے لگ گیا ہو تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میرا ارادہ صرف اتنا تھا کہ پستول آپ کے ہاتھ میں نہ رہے۔" اس نے کہا۔

نیمہ نے اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھا، ابھی وہ حیران ہی تھی کہ جوجی کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا، ساتھ ہی اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پستول کے گرد ایک رسی لپٹتی نظر آئی، پھر پستول گویا ہوا میں اڑتا ہوا غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ غسل خانے کا دروازہ پورا کھل گیا اور فاروق مسکراتا ہوا اندر سے نکل کر ان کی طرف بڑھنے لگا۔

"خوش آمدید دوستو... تم لوگ اگر مہمان نہ ہوتے تو ہم ذرا مختلف قسم کا سلوک کرتے اور تم لمبے لمبے لیٹے نظر

آتے۔" اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

"مت بھولو، ابھی میرے ہاتھ میں پستول موجود ہے اور میرا نشانہ بے خطا ہے، پستول میں پوری چھ گولیاں ہیں اور تم لوگوں کی تعداد بھی چھ ہے۔ ہر ایک کے حصے میں ایک ایک گولی آئے گی۔" غیر ملکی نے غراہٹ نما آواز میں کہا۔

"کم از کم میرا گزارا ایک گولی سے نہیں ہوگا، میں اتنا چھوٹا نہیں۔" فاروق بولا۔

"یہ مذاق کا وقت نہیں۔" یہ کہتے ہوئے فرزانہ پلنگ کے نیچے سے نکل آئی۔ اس کے ہاتھ میں گڑیا تھی، گڑیا کا منہ غیر ملکی کی طرف تھا۔

"تو پھر کس چیز کا وقت ہے، کیا گڑیا سے کھیلنے کا وقت ہے اور وہ بھی پلنگ کے نیچے لیٹ کر۔" فاروق نے شوخ لہجے میں کہا۔

"فرزانہ گڑبڑ نہ کرنا۔" انسپکٹر جمشید نے اس کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور وہ سمجھ گئی کہ وہ نہیں چاہتے، غیر ملکی ابھی بے ہوش ہو جاتے۔ اس کے تین ساتھی پہلے ہی بے کار ہو چکے تھے، اب وہ اکیلا ہی رہ گیا تھا، اگرچہ اس کے ہاتھ میں پستول تھا، لیکن وہ

اس پر جب جی چاہے قابو پا سکتے تھے۔ نسیمہ، محمود، فاروق اور فرزانہ کو حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی، شاید وہ سوچ رہی تھی کہ یہ کیسے بچے ہیں، جن کے چہروں پر خوف کا نام و نشان تک نہیں۔

"اب دو دو باتیں ہو جائیں، یہ ہو سکتا ہے کہ تم بہت اچھے نشانہ باز ہو اور اس پستول میں چھ گولیاں موجود ہوں۔ لیکن میرے پاس بھی ایک ایسی چیز موجود ہے جو تم لوگوں کے ہوش اڑا دینے کے لیے بہت کافی ہو گی، اگر تم اجازت دو تو وہ چیز اپنی جیب سے نکال کر دکھا دوں۔" انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔ محمود، فاروق اور فرزانہ سوچ میں پڑ گئے کہ وہ کیا چیز ہے کیونکہ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔

"خبردار... تم جیب میں ہاتھ نہیں ڈالو گے، میں جانتا ہوں، جیب میں پستول ہو گا۔"

"نہیں پستول نہیں ہے، تم خود جیب میں ہاتھ ڈال کر وہ چیز نکال سکتے ہو۔" انسپکٹر جمشید مسکرا کر بولے۔

"بہت خوب میں ضرور ایسا کروں گا۔"

یہ کہہ کر غیر ملکی آگے بڑھا۔ اس نے ان کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر جب اس کا ہاتھ باہر نکلا تو وہ بڑے زور سے اچھلا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔

محمود، فاروق اور فرزانہ نے دیکھا، اس کے ہاتھ میں دو گھنٹیاں تھیں جو فاروق اور فرزانہ کو ملی تھیں۔

خود ان کی آنکھیں بھی حیرت سے پھیل گئیں۔

O

"یہ... یہ گھنٹیاں یہاں کس طرح پہنچ گئیں۔" غیر ملکی چلایا۔

"یہ میرے بچوں کو گھر کے باہر پڑی ملی تھیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"تم... تم کون ہو... تمہارا نام کیا ہے؟" غیر ملکی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"میرا نام نہ پوچھو تو بہتر ہے، کہیں بے ہوش نہ ہو جاؤ، ویسے ان گھنٹیوں کو دیکھ کر تمہیں میرا نام پوچھنے کا خیال کیوں آیا؟"

"نام بتاؤ۔" اس نے تقریباً چلا کر کہا۔

"بتا دوں گا نام بھی... پہلے یہ بتاؤ، یہ سب چکر کیا ہے۔"

"اگر تمہیں چکر کا پتا نہیں تو گھنٹیوں کے بارے میں کس طرح اندازہ لگایا۔"

"میں ایسے اندازے لگا لیا کرتا ہوں، ایک ہی گھر کے دروازے پر دو ایک جیسی گھنٹیوں کا ملنا بغیر مقصد کے نہیں ہو سکتا جب کہ

آج کل میں ہمارے ہاں کوئی ملاقاتی بھی نہیں آیا، لہٰذا میں نے ان گھنٹیوں کو غور سے دیکھا۔ بہت دیر تک سوچا اور پھر ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔" انسپکٹر جمشید کا لہجہ پُراسرار بھی تھا اور مسکراہٹ میں ڈوبا ہوا بھی۔

"اور وہ نتیجہ کیا ہے۔" غیر ملکی نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔

"نتیجہ یہ ہے کہ یہ گھنٹیاں در اصل خطرے کی گھنٹیاں ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"کیا مطلب؟" غیر ملکی کی بجائے محمود، فاروق اور فرزانہ کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"مطلب یہ کہ یہ گھنٹیاں گھنٹیاں نہیں ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"جی!!!" ان کی آنکھیں باہر کو اُبل پڑیں۔

"ہاں... یہ در اصل ٹرانسمیٹر ہیں اور جس گھر میں یہ موجود ہیں، اس گھر کی گفتگو یہاں سے بہت فاصلے پر بھی بغور سنی جا سکتی ہے۔"

"اوہ!" وہ دھک سے رہ گئے۔

"لیکن ابّا جان! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان گھنٹیوں کا تعلق ان حضرات سے ہی ہو، آپ نے یہ کیسے جانا، جب کہ

ان گھنٹیوں کی یہاں موجودگی سے خود یہ بے خبر ہیں۔" فرزانہ نے اعتراض کیا۔

"تم نے بہت اچھا سوال پوچھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ گھنٹیاں صرف ایک گھر کے دروازے پر نہیں بلکہ کئی گھروں کے دروازوں پر پھنکوائی گئی ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"پہلے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس شہر کے کس کس گھر کے دروازے پر گھنٹیاں پھنکوائی جائیں اور پھر ان گھروں سے واقف لوگوں کے ذریعے سے یہ کام لیا گیا، یہ کام لینے والے ان گھروں سے واقف نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ ان صاحب کو بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ایک اتفاق انہیں ایسے گھر میں لے آیا ہے جس گھر میں ان کی گھنٹیاں پہنچائی جا چکی ہیں۔"

"سوال یہ ہے کہ دو گھنٹیوں کی کیا ضرورت تھی؟" محمود نے پوچھا۔

"تاکہ کم از کم ایک گھنٹی تو گھر کے کسی فرد کے ہاتھ لگ جائے اور وہ بے خیالی میں اسے اٹھا کر گھر کے اندر لے جائے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"بہت خوب! لیکن اتنی باتیں معلوم ہو جانے کے بعد بھی معاملہ ابھی تک صاف نہیں ہوا، اور ہاں... آپ نے ابھی

تک یہ بھی نہیں بتایا۔ آپ کو یہ کس طرح معلوم ہوا کہ گھنٹیوں کا تعلق ان سے ہے۔"

"اس شخص کے کالر پر نظر ڈالو، یہاں تمہیں ایک کالر پن لگا دکھائی دے گا، لیکن اگر تم غور سے اسے دیکھو تو دراصل یہ ایک نہایت ننھا سا لاؤڈ سپیکر ہے جس میں سے مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی سی آواز آتی ہے، پھر یہ بھنبھناہٹ باریک سی آواز کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔"

"پھر تو انہیں بہت پہلے یہ بات معلوم ہو جانی چاہیے تھی کہ اس گھر میں گھنٹیاں موجود ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"ان گھنٹیوں کا راز دوسروں سے چھپانے کے لیے لاؤڈ سپیکر پر آوازوں کو ان کے سامنے سننے کی کوشش نہیں کی جا سکتی تھی۔ آوازیں سننے کے لیے سپیکر کو ہاتھ کی رگڑ سے حرارت پہنچانی پڑتی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے، یہ صاحب کافی دیر سے بھاگ دوڑ میں مصروف ہیں، کیونکہ اس زخمی کو ٹھکانے لگانے کا کام سب سے زیادہ ضروری تھا۔ اب یہ اور بات ہے کہ اس وقت تک اپنی پوری کوشش کے باوجود یہ اسے ختم نہیں کر سکے، شاید خدا کو یہ منظور نہیں۔" انسپکٹر جمشید انہیں بتاتے چلے گئے۔

"آخر یہ کیا چکر ہے؟" فرزانہ نے بے چین ہو کر کہا۔

"چکر... ہاں، چکر کا اندازہ مجھے ابھی تک نہیں ہو سکا۔ یوں میں خیالی گھوڑے ضرور دوڑاتا رہا ہوں۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"اور وہ خیالی گھوڑے کہاں تک پہنچے۔" فاروق نے پوچھا۔

"ذرا ٹھہرو۔ میں دیکھ رہا ہوں، زخمی ہوش میں آنے والا ہے اور ہمیں اس کے ہوش میں آنے کا ہی انتظار تھا۔"

سب کی نظریں زخمی کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ واقعی ہوش میں آ رہا تھا اور پھر اچانک اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ فوراً ہی اس کے منہ سے نکلا۔

"میری بچی نسیمہ۔ تم کہاں ہو۔"

گڑبا کا شکار

"بابا! میں یہاں ہوں۔" نسیمہ نے تڑپ کر کہا اور تیزی سے اپنے باپ کی طرف بڑھی، لیکن غیر ملکی نے اس کی ٹانگوں میں ٹانگ اڑا دی اور وہ منہ کے بل گری، اس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور جب اس نے منہ اوپر اٹھایا، تو اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ اس بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر محمود، فاروق اور فرزانہ کا خون کھول اٹھا۔

"تمہیں اس خون کا حساب دینا پڑے گا۔" محمود نے کہا۔

"بکو مت۔۔۔ میرے ہاتھ میں پستول ہے۔" غیر ملکی بُرا سا منہ بنا کر گرجا۔

"یہ بات ہمیں بہت اچھی طرح معلوم ہے۔" فاروق نے اس سے بھی بُرا منہ بنایا۔

"اور اب تم اپنے انجام کے لیے تیار ہو جاؤ۔" فرزانہ یہ کہہ کر گڑبا کا پیٹ دبانے ہی چلی تھی کہ انسپکٹر جمشید ہاتھ اٹھاتے ہوئے بول پڑے۔

"ٹھہرو بھئی! ہم نسیمہ کے جسم سے بہنے والے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب ضرور لیں گے، لیکن پہلے یہ تو معلوم کر لیں کہ یہ چکر کیا ہے، محمود۔۔۔ تم نسیمہ کو اٹھا کر ایک کرسی پر بٹھا دو، اس کے ہاتھ میں رومال دے دو، تاکہ یہ ناک پر رکھ سکے اور اب میں نسیمہ کے باپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے، اس کا نام کیا ہے، یہ لوگ اس کی جان لینے پر کیوں تلے ہیں، انہیں اس سے کیا دشمنی ہے۔" انسپکٹر جمشید رُکے بغیر کہتے چلے گئے۔

جمال بابا نے گردن گھما کر ان کی طرف دیکھا اور اس طرح اسے باقی لوگ بھی نظر آ گئے، اس کے چہرے پر خوف کے آثار طاری ہو گئے۔

"اُف خدا!۔۔۔ یہ لوگ یہاں تک پہنچ گئے۔" اس نے تھرتھر کانپتی آواز میں کہا۔

"ہاں! تمہیں ختم کرنے تک ہم چین کا سانس کس طرح لے سکتے ہیں۔" غیر ملکی نے کہا۔

"مسٹر جارج۔۔۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں، میری بچی پر رحم کریں، میں اپنی زبان کبھی نہیں کھولوں گا، زندگی بھر کے لیے اس پر تالا لگا دوں گا۔" جمال بابا نے گڑگڑا کر کہا۔

"تم جو کچھ کہہ رہے ہو، ہم اس پر کیسے یقین کر سکتے ہیں،

تم اس وقت جس آدمی کے گھر میں ہو، وہ ایک سرکاری آدمی
ہے اور تمہیں زبان کھلوانے پر مجبور کر سکتا ہے۔" مسٹر جارج
نے کہا۔

"نہیں! میں جیتے جی مر جاؤں گا، پر زبان نہیں کھولوں گا۔"

"ہم کوئی خطرہ مول لینے پر تیار نہیں، یہ خطرہ تمہاری
موت کے بعد ہی ٹل سکتا ہے، تمہیں ختم کر کے میں یہاں سے
نکل جاؤں گا، ساتھ ہی اس گھر کے سب افراد کو بھی ختم
کرتا جاؤں گا، تاکہ کل کوئی یہ کہنے والا نہ ہو کہ اس واردات
میں میرا ہاتھ ہے اور اس کے بعد کسی کو بھی کچھ معلوم نہ ہو گا۔"
مسٹر جمال سفاک لہجے میں کہتا چلا گیا۔

"نہیں، نہیں، میری بچی پر ترس کھاؤ، اس نے ابھی دنیا
کا کچھ بھی نہیں دیکھا۔"

"ترس کھاتا ہوں تو خود کہیں کا نہیں رہتا۔"

"اُف خدا۔ اب کیا ہو گا۔"

"بیٹی نسیمہ... تمہارے باپ کا نام کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید
بولے۔

"جی... جمال بابا۔" اس نے ناک پر سے رومال ہٹا کر
جلدی سے کہا، رومال ہٹاتے ہی خون پھر بہنے لگا اور اس
نے پھر رومال رکھ لیا۔

"تو تم اپنے بابا کو بتا دو کہ ہم تمہارے ہمدرد ہیں اور ان
لوگوں کے چنگل سے بچانے کے لیے اس وقت تک کیا کچھ
کر چکے ہیں۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"یہ بالکل ٹھیک ہے بابا۔" نسیمہ نے کہا۔

"میں ان کا احسان مند ہوں بیٹی۔" بوڑھے جمال بابا نے
آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر سب کچھ بتا دو۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔"

"مسٹر جارج میرے سر پر پستول لیے کھڑے ہیں اور
آپ کہتے ہیں، میں سب کچھ سچ سچ بتا دوں۔" جمال بابا
کے لہجے میں تلملاہٹ تھی۔

"اس پستول سے نکلنے والی کوئی گولی تمہاری جسم کا
رُخ نہیں کر سکے گی، یہ میرا اعلان ہے۔" انسپکٹر جمشید
بولے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے، آخر میری طرف بڑھنے والی گولی
کو کیا چیز روک لے گی۔" جمال بابا کے لہجے میں حیرت تھی۔

"خبردار جمال بابا۔ ادھر تم نے زبان کھولی، ادھر گولی
تمہاری کھوپڑی کے پار ہوئی اور دوسری گولی تمہاری بیٹی
کے سینے میں داخل ہو جائے گی۔" مسٹر جارج نے بلند آواز
میں کہا۔

"دھمکیوں میں آنے کی ضرورت نہیں . . . اچھا . . . تم میری صرف ایک بات کا جواب دے دو، اس کے بعد شاید میں خود بخود بہت کچھ سمجھ جاؤں گا۔"

"اس کی کسی بات کا بھی جواب نہ دینا۔" غیر ملکی مسٹر جارج نے پھنکار کر کہا۔

"کیا تم کسی کان میں ملازم ہو۔"

انسپکٹر جمشید کا یہ سوال جیسے ایک دھماکا تھا، نہ صرف جمال بابا بلکہ مسٹر جارج اور نسیمہ بھی چونک اٹھے، لیکن بوڑھا منہ سے کچھ نہ بولا۔

"تم منہ سے نہ کہو، تب بھی مجھے میرے سوال کا جواب مل چکا ہے اور اب تو میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ وہ کان شہر کے جنوبی حصے میں واقع ہے۔"

ان کی آنکھیں مارے حیرت کے پھیلتی چلی گئیں . . . وہ دم بخود رہ گئے۔ پھر مسٹر جارج کے منہ سے ہکلاہٹ سے لبریز آواز میں نکلا۔

"تت . . . تت . . . تم یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہو۔"

"اس لیے کہ تمہارے واسطہ انسپکٹر جمشید سے ہے جس [illegible] تمہیں سب سے زیادہ خطرہ تھا اور جس کے گھر کے دروازے پر تم نے دوسہ دن کے ساتھ گھنٹیاں ڈلوا دی تھیں، [illegible]

تمہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ تم جمال بابا کے پیچھے بھاگتے ہوئے مجھ تک ہی آ جاؤ گے۔"

"کیا!!" مسٹر جارج کے منہ سے دھاڑنے کے انداز میں نکلا۔ اس کی آنکھیں خوف کی وجہ سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دوسری طرف نسیمہ کا برا حال تھا، وہ محمود، فاروق اور فرزانہ کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس دنیا کی مخلوق نہ ہوں۔

"تو . . . تم انسپکٹر جمشید ہو۔"

"ہاں! تمہاری بدقسمتی ہے۔ اور اب چلاؤ گولی تم جمال بابا پر۔"

"ہاں ہاں ضرور چلاؤں گا، اب تو گولی چلانا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے ٹریگر پر انگلی کا دباؤ ڈالا، لیکن اس سے پہلے فرزانہ نے گڑیا کا پیٹ دبا دیا، مسٹر جارج کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور وہ دھڑام سے گرا، اس کا جسم بے حس و حرکت ہو گیا۔

○

کمرے میں چند لمحوں کے لیے موت کی خاموشی چھا گئی۔ اب انسپکٹر جمشید ایک کرسی جمال بابا کے نزدیک گھسیٹ لے گئے اور اس پر بیٹھ گئے، محمود، فاروق اور فرزانہ نے بھی

کرسیاں سنبھال لیں۔ جارج کی طرف سے اب انہیں کوئی خطرہ
نہیں رہا تھا۔ اس کے باقی دو ساتھی بھی بے ہوش بیٹھے، تیسرا
بندھا پڑا تھا، تاہم احتیاط کے طور پر انسپکٹر جمشید نے اپنا
ریوالور ہاتھ میں لے لیا۔

"جمال بابا... اب یہ لوگ ہمارے رحم و کرم پر ہیں...
اب ذرا جلدی بتاؤ، یہ کیا چکر ہے۔"

"ایک مسٹر جارج پر قابو پا کر آپ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اب
میری زندگی کو کوئی خطرہ نہیں رہا... جب کہ ان کے ہاتھ
بہت لمبے ہیں... مسٹر جارج تو کان کا صرف منیجر ہے، اس
کے مالکان ابھی باقی ہیں اور وہ لوگ کوئی دم میں یہاں پہنچنے
والے ہوں گے۔" جمال بابا نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔

"تم ان کی فکر نہ کرو۔ یہ بتاؤ معاملہ کیا ہے؟" انسپکٹر
جمشید بولے۔

"آپ کس حد تک جانتے ہیں، آپ نے یہ کس طرح اندازہ لگا
لیا کہ میں کسی کان میں ملازم ہوں اور یہ بھی کہ وہ کان شہر کے
جنوبی حصے میں واقع ہے۔"

"شہر کے جنوبی حصے کی ایک کان کے بارے میں چند روز
پہلے ایک خبر شائع ہوئی تھی، خبر یہ تھی کہ جس کان کی دس
سال تک کھدائی ہوتی رہی اور اس میں سے آج تک سونے

کا ایک ذرہ بھی نہ نکلا، اسے ایک روسی کمپنی نے اس کے
مالکان سے خرید لیا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ کان پانچ
کروڑ روپے میں خریدی گئی ہے، یہ خبر میں نے بھی پڑھی تھی
اور میں نے اس خبر پر بہت دیر تک غور کیا تھا، آخر یہ سوچ
کر رہ گیا تھا کہ روسی ماہرین کو اس میں سونا ملنے کے امکانات
روشن نظر آئے ہوں گے، میں نے تمہارے جسم اور کپڑوں کا
غور سے جائزہ لیا تھا اور اس نتیجے پر نہایت آسانی سے پہنچ
گیا تھا کہ تم ایک کان کن ہو، کان کنوں کے ہاتھوں پر خاص قسم
کے گٹے پڑ جاتے ہیں اور ان کے کپڑے بھی صاف نظر آ جاتے
ہیں۔ اس طرح میں نے ان دو باتوں کا اندازہ لگایا، لیکن سوال
یہ ہے کہ کیا کان میں سے سونا نکل آیا ہے، اگر ایسا ہے تو اس
میں راز کی کیا بات ہے، سونا تو اور بھی کئی کانوں سے نکل چکا ہے
اور میں جانتا ہوں کہ حکومت نے یہ کانیں صرف اس شرط پر
فروخت کی ہیں کہ ان میں سے نکلنے والی دھاتیں اور معدنیات
ہمارے ملک سے باہر نہیں جانے دی جائیں گی تو کیا موجودہ
مالکان سونا باہر سمگل کرنا چاہتے ہیں، کیوں جمال بابا، یہی
بات ہے۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہو گئے اور سوالیہ نظروں سے
جمال بابا کی طرف دیکھنے لگے، محمود، فاروق، فرزانہ اور نسیمہ پہلے

ہی اس پر نظریں جمائے بیٹھے تھے، آخر اس کے لب ہلے۔
"اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بہت تیز نظر رکھتے ہیں اور بڑی حد تک صحیح نتائج نکال لیتے ہوں گے... پہلے تو میں یہ بتاؤں گا کہ میں کان میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ مسٹر جارج کے گھر کا کام کاج بھی کرتا ہوں، ان کا کوارٹر کان کے نزدیک ہی ہے، مسٹر جارج پہلے مالکان کے زمانے کے ملازم ہیں، نئے مالکان نے بھی انہیں ملازمت پر رہنے دیا، یہ آج عشا کے بعد کی بات ہے، میں نے مسٹر جارج کے گھر کا کام نپٹایا اور رخصت کی اجازت لینے کے لیے مسٹر جارج کے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہاں کان کے نئے مالکان موجود تھے یہ تینوں روسی تھے۔ مجھے دیکھ کر یہ ایک دم خاموش ہو گئے۔ پھر جارج نے جلدی سے کہا، ٹھیک ہے جمال بابا، تم جا سکتے ہو، میں باہر نکل آیا، لیکن گیا نہیں۔ دروازے سے لگ کر کھڑے ہو کر میں نے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی، کیونکہ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ مجھے دیکھ کر خاموش کیوں ہو گئے ہیں، ان کی گفتگو تو میں نے سن لی، لیکن اس میں مجھے عجیب بات کوئی نظر نہ آئی۔ میں واپس جانے کے لیے مڑا، تو میرا ہاتھ دروازے سے لگ گیا جس سے کھٹکا ہوا۔ فوراً ہی مسٹر جارج نے دروازہ کھول ڈالا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی

چلا اٹھے، تم اب تک یہاں موجود ہو... جاؤ... بھاگ جاؤ میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو میں نے کان کے ایک مالک کو کہتے سنا... اس نے ساری گفتگو سن لی ہے، اب اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے خطرناک ہو سکتا ہے، مسٹر جارج تین چار آدمی ساتھ لے جاؤ اور اسے راستے میں کہیں ختم کر دو، یہ الفاظ میں نے بھی سن لیے... بس میری تو جیسے جان نکل گئی، میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی تھی، اس لیے سڑکوں پر کافی آمد و رفت تھی، یہ میرا تعاقب ایک کار میں کرتے ہوئے میرے گھر کی گلی تک پہنچ گئے، میں گھر میں گھس گیا اور پھر میری بیٹی مجھے چھت کے ذریعے نکال لائی، ہم بھاگتے بھاگتے یہاں تک پہنچ گئے، بس یہ ہے کل کہانی۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔
"لیکن اس کل کہانی میں وہ گفتگو شامل نہیں جسے سننے کے لیے ہم سب سے زیادہ بے تاب ہیں۔" فاروق نے جلدی سے کہا۔
"اگر آپ کا یہ خیال درست ہے کہ یہ گھنٹیاں دراصل ٹرانسمیٹر ہیں تو پھر کان کے مالکان یہاں ہونے والی گفتگو کا ایک ایک لفظ سن چکے ہوں گے اور وہ یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے، کیونکہ وہ بہت جلد یہ معلوم کر لیں گے کہ

انسپکٹر جمشید کا گھر کہاں ہے اس صورت میں آپ سوچ سکتے ہیں کہ ہم کس حد تک محفوظ ہیں۔"

"اوہ! بابا تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ پہلے میں ان کا بندوبست کر لوں ۔ محمود، فاروق، فرزانہ تم تینوں فوری طور پر چھت پر چلے جاؤ اور چاروں طرف نظر رکھو، میں فون کر کے پولیس کو بلواتا ہوں، کیونکہ یہ معاملہ صرف جمال بابا اور نسیمہ بیٹی کی زندگی کا ہی نہیں، پورے ملک کا ہی معلوم ہوتا ہے۔۔۔ اور یہ ہمیں ان کی گفتگو سن کر ہی معلوم ہوگا، لیکن گفتگو سننے سے زیادہ ضروری حفاظتی اقدام کرنا ہے۔۔۔ کہیں ایسا نہ ہو۔۔۔ وہ جدید ہتھیاروں سے لیس ہو کر ہم پر آ پڑیں۔۔۔ جو لوگ گھنٹی نما ٹرانسمیٹروں سے کام لے سکتے ہیں، ان کے پاس اور نہ جانے کتنی قسم کے ہتھیار ہوں گے، جلدی کرو۔"

یہ الفاظ انسپکٹر جمشید نے بوکھلاہٹ سے لبریز لہجے میں کہے تھے، محمود، فاروق اور فرزانہ کی سٹی گم ہو گئی، وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ معاملہ یکایک اس قدر اہمیت اختیار کر جائے گا۔

وہ باہر جانے کے لیے کمرے کے دروازے کی طرف دوڑے ہی تھے کہ دروازے کی گھنٹی بجی اور ان کے اٹھتے قدم رک گئے۔

خوفناک لمحات

"رک کیوں گئے، تم جاؤ۔۔۔ جو کہا ہے، کرو۔" انسپکٹر جمشید نے جھلا کر کہا اور وہ دوڑتے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ جمال بابا کی طرف مڑے۔

"میں دروازہ کھولنے جا رہا ہوں۔۔۔ کچھ نہیں کہہ سکتا، دروازے پر کون ہو گا، اگر چاہو تو تمہیں ادھر اُدھر چھپا دوں۔"

"وہ۔۔۔ وہ ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے۔" جمال بابا نے کانپ کر کہا۔

"تو پھر تم بھی چھت پر چلے جاؤ، محمود، فاروق اور فرزانہ تمہارے بچاؤ کی کوئی تدبیر کر لیں گے۔ تم ان پر بھروسہ کر سکتے ہو۔"

"اچھا!" اس نے کہا اور جلدی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نسیمہ بھی اس کے ساتھ اُٹھی تھی۔ انسپکٹر نے بیگم کو اشارہ کیا کہ وہ انہیں چھت کا راستہ دکھا دیں اور بیگم جمشید کو بھی ساتھ لے جائیں۔

"اس طرح آپ بالکل تنہا رہ جائیں گے اور یہ معلوم نہیں کہ دشمنوں کی تعداد کیا ہے۔" بیگم جمشید نے فکر مند ہو کر کہا۔

"پروا نہ کرو، میں دیکھ لوں گا۔"

"کیوں نہ دروازہ کھولنے سے پہلے فون کر دیا جائے۔"

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا، تم لوگ چھت پر جاؤ۔"

"کیا وہ لوگ یہ گفتگو نہیں سن لیں گے۔" نسیمہ نے سوال کیا۔

"جہاں تک میں سمجھتا ہوں، چلتے پھرتے اس آلے پر گفتگو نہیں سنی جا سکتی ۔ کیونکہ آواز نہایت باریک ہوتی ہو گی اور لاؤڈ سپیکر کو کان کے قریب لے جانا پڑتا ہو گا۔" انہوں نے جواب دیا، اور وہ چھت پر جانے کے لیے کمرے سے نکل گئے۔

اسی وقت دروازے کی گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ انسپکٹر جمشید مسکرا اُٹھے۔ انہوں نے کمرے پر ایک نظر ڈالی۔ ایک الماری کا ایک پٹ کھول کر چند سیکنڈ تک اس میں کچھ کرتے رہے اور پھر دروازے کی طرف چل پڑے۔ وہ دبے پاؤں دروازے پر پہنچے اور کچھ پوچھے بغیر دروازے کی چٹخنی آواز پیدا کیے بغیر گرا دی، پھر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد گھنٹی ایک بار پھر بجائی گئی اور ساتھ ہی دروازہ بھی دھڑ دھڑایا گیا، جس کی وجہ سے وہ کھل گیا۔

کسی نے کہا۔

"ارے! دروازہ تو کھلا ہے۔"

یہ جملہ انگریزی میں کہا گیا تھا۔ پھر تین آدمی اندر داخل ہوئے، ان کے ہاتھوں میں سٹین گن جیسی تین بندوقیں تھیں جو سائز میں ان سے کافی چھوٹی تھیں، وہ دائیں بائیں دیکھے بغیر آگے بڑھتے چلے گئے اور جب صحن میں سے ہوتے ہوئے اس کمرے میں داخل ہو گئے جس میں مسٹر جارج اور اس کے ساتھی موجود تھے تو انہوں نے دروازہ اندر سے بند کر کے تالا لگا دیا۔ اب بھاگنے کی صورت میں یہ لوگ فرار نہیں ہو سکتے تھے اور اگر ان کے کچھ ساتھی باہر تھے تو وہ اندر نہیں آ سکتے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اس کمرے کی طرف بڑھے، لیکن پھر ٹھٹک کر رک گئے۔ محمود دبے پاؤں نیچے اتر آیا۔ انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے نزدیک جا کر اپنا کان اس کے منہ کے قریب لے گئے۔

"مکان کے ارد گرد تقریباً پچاس آدمی موجود ہیں۔"

"کیا!!!"

انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا، ان کی آنکھیں حیرت کی وجہ سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"اور وہ سب کے سب مسلح ہیں۔"

"ہوں۔ خیر تم فکر نہ کرو، چھت پر مورچہ سنبھالے رہو، اگر وہ کوئی دھمکی دیں تو تم کہہ سکتے ہو کہ ان کے چھ ساتھی ہمارے قبضے میں ہیں اگر انہوں نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو ان چھ کے چھ کو ہلاک کر دیا جائے گا۔" انہوں نے کہا۔

"بہت بہتر۔" محمود نے کہا اور واپس چھت پر چلا گیا۔

اب انسپکٹر جمشید کمرے کی طرف بڑھے اور دروازے میں داخل ہوتے ہوئے بولے۔

"میں اپنے مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔"

کمرے میں کھڑے ہوئے تینوں آدمی اس سے پہلے اپنے تین ساتھیوں کو دیکھ رہے تھے، ان کی آواز سن کر تیزی سے مڑے اور پھر انہیں خالی ہاتھ دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے۔

"تم انسپکٹر جمشید ہو۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہاں! تمہارا خیال ٹھیک ہے۔"

"اور تم خالی ہاتھ بھی ہو۔" دوسرا بولا۔

"یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"جمال نامی آدمی کہاں ہے۔"

"کیوں... اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اس مکان کو گھیرے میں لیا جا چکا ہے، ہمارے ایک

اشارے پر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔"

"اینٹ سے اینٹ بجتے ہوئے موسیقی تو بہت اچھی پیدا ہوتی ہوگی، میں اسے شوق سے سنوں گا۔" انسپکٹر جمشید خوش ہو کر بولے۔

"زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں، ہمارے ہاتھوں میں اس وقت جو بندوقیں ہیں، یہ عام بندوقیں نہیں۔" ایک نے کہا۔

"تو پھر خاص قسم کی ہوں گی، اس سے کیا فرق پڑ جائے گی۔"

"بہت فرق پڑتا ہے... پہلے سن لو... جونہی ہم میں سے کوئی ٹریگر دبائے گا، اس کی نالی میں سے سیکڑوں ننھی ننھی گولیاں نکل کر کئی مربع فٹ میں بکھر کر تیر کی طرح آگے جائیں گی، اور پھر جو بھی ان کی لپیٹ میں آ جائے گا، وہ دوسرا سانس نہیں لے سکے گا، کیونکہ ایٹمی گولیاں ہیں اور جسم میں داخل ہو کر اس تیزی سے گردش کرتی ہیں کہ آناً فاناً ہی انسانی جسم ایک چھلنی بن جاتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

انسپکٹر جمشید سناٹے میں آ گئے، کیونکہ کئی مربع فٹ میں بکھر کر سفر کرنے والی سیکڑوں گولیوں سے بچنا کوئی ہنسی کھیل نہیں تھا، پستول سے نکلنے والی گولی سے بچنا اور بات ہے، انہوں نے محسوس کیا، زندگی میں پہلی مرتبہ وہ

صحیح معنوں میں خطرے میں ہیں۔

○

"فاروق... محمود... میرا دل گھبرا رہا ہے۔" فرزانہ نے دبی آواز میں کہا، وہ سب اس وقت چھت پر پیٹ کے بل لیٹے ہوئے تھے اور ٹھنڈی چھت انہیں برف کی بنی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسے میں کبھی کبھی ان کے دانت بھی بج اٹھتے... جنہیں وہ مضبوطی سے ایک دوسرے پر جما لیتے۔

"اب میں اس وقت تمہارے لیے سیب کا مربہ یا خمیرہ گاؤ زبان عنبری جواہر والا کہاں سے لاؤں۔" فاروق نے بھی دھیمی آواز میں کہا، مگر اس کے لہجے میں جھلاہٹ زیادہ تھی۔

"معلوم ہوتا ہے، ان دنوں دیسی طریقہ علاج پر کتابیں پڑھتے رہتے ہو۔" محمود مسکرایا۔

"نہیں تو... میں نے تو ابھی تک انگریزی دواؤں کے بارے میں بھی کچھ نہیں پڑھا۔" فاروق بولا۔

"میرا مطلب یہ تھا کہ کہیں ابا جان سے غلطی نہ ہو گئی ہو۔" فرزانہ بولی۔

"غلطی۔ بھلا وہ کیسے؟" محمود چونکا۔

"ہمیں اوپر بھیج کر وہ اب تین دشمنوں کے مقابلے میں تنہا ہیں اور خالی ہاتھ بھی، جب کہ دشمن نہ جانے کس قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہے، جو لوگ ہمارے گھر کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں، ان کے ہاتھوں میں نظر آنے والی سٹین گنیں میں نے پہلی مرتبہ دیکھی ہیں۔"

"پھر کیا کیا جائے۔"

"ہم میں سے کم از کم دو کو نیچے جا کر ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سننی چاہیے۔" فرزانہ نے تجویز پیش کی۔

"گفتگو تو ایک آدمی بھی سن سکتا ہے۔" محمود بولا۔

"لیکن وہ دروازہ چھوڑ کر حالات جاننے کے لیے اوپر نہیں آ سکتا۔" فرزانہ بولی۔

"ہوں ٹھیک ہے تو پھر تمہارے خیال میں ہم میں سے کن دو کو نیچے جانا چاہیے؟" فاروق نے پوچھا۔

"تمہیں اور محمود کو۔ میں چھت پر رہوں گی۔" فرزانہ نے کہا۔

"بڑی کام چور ہو۔ خود مزے سے لیٹی رہو گی اور ہم نیچے جائیں۔"

"ہاں! یہ چھت اتنی ہی مزے دار ہے نا۔" فرزانہ نے جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"اچھا تو ہم جاتے ہیں۔"

محمود اور فاروق دبے پاؤں چلتے ہوئے نیچے اُتر آئے اور

دروازے سے کان لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اس وقت اندر آنے والوں میں سے ایک اس عجیب و غریب سٹین گن کے بارے میں بتا رہا تھا، دونوں نے اس کے الفاظ سنے اور دھک سے رہ گئے، انہوں نے سوچا، اگر وہ اس وقت کچھ نہ کر سکے تو پھر ان سب کا خدا ہی حافظ ہے۔ انہیں فرزانہ کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی۔ اس وقت وہی کوئی ترکیب بتا سکتی تھی، چنانچہ فاروق چھت پر گیا اور فرزانہ کو بلا لایا۔ اس کے کان میں ساری بات بتائی تو وہ فکر مند ہو گئی، لیکن پھر اچانک اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اس نے دونوں کو اپنے کان نزدیک کرنے کے لیے کہا اور پھر انہیں کچھ بتانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اس کی بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔

آخری حملے

انسپکٹر جمشید چند لمحے تک خاموش رہے، آخر انہوں نے کہا۔

"میں نے تمہاری تین گنوں کی تعریف سن لی، موت اور زندگی کی میری نظروں میں کوئی اہمیت نہیں، میں تو روز ہی موت سے کھیلتا ہوں، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا ہوں، اگر آج موت میرا مقدر بن چکی ہے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، تم لوگ یہ بتاؤ چاہتے کیا ہو۔"

"جمال بابا اور اس کی بیٹی کہاں ہے۔۔۔ تم نے ان دونوں کو کہاں چھپایا ہے؟" ان میں سے ایک نے پوچھا اور انسپکٹر جمشید سمجھ گئے کہ چلتے پھرتے ہوئے وہ واقعی ٹرانسمیٹر پر آوازیں نہیں سن سکتے۔۔۔ انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ بات کیا ہے تو میں جمال بابا کو تمہارے حوالے کرنے کے بارے میں سوچ سکتا

ہوں۔"

"صرف سوچ سکتے ہو۔۔۔ حوالے کر دو گے نہیں۔" ایک نے برا سا منہ بنا کر کہا، یہ تینوں بھی جارج کی طرح غیر ملکی تھے۔

"آخر تم بتا کیوں نہیں دیتے۔" انسپکٹر جمشید جھلا اٹھے۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ان کی تین گنوں سے کس طرح نجات حاصل کی جائے۔۔۔ اس وقت انہیں یہ احساس بھی ستا رہا تھا کہ انہوں نے محمود، فاروق اور فرزانہ کو چھت پر کیوں بھیج دیا۔۔۔ ان میں سے ایک کو بھی تو چھت پر بھیجا جا سکتا تھا۔

"بات نہیں بتائی جا سکتی۔۔۔ ہم جانتے ہیں، باقی لوگ یہیں کہیں چھپے ہوئے ہیں۔۔۔ پہلے ہم تمہارا کانٹا نکال دیں، اس کے بعد ان سے سمجھیں گے۔"

"یہ اچھی بات ہے کہ تم پہلے میرا کانٹا نکالو گے، معلوم ہوتا ہے کانٹا نکالنے میں بہت ماہر ہو، لیکن میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میرا مکان اس وقت پولیس کے گھیرے میں ہے اور تم بچ کر نہیں جا سکتے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

اس کے جواب میں ان تینوں نے زوردار قہقہہ لگایا اور کافی دیر تک ہنستے رہے، آخر ان کی ہنسی رکی اور ان

میں سے ایک بولا۔

"ہم نے اس سے بڑا جھوٹ آج تک نہیں سنا، تمہاری اطلاع کے لیے عرض کر دیں کہ مکان پولیس کے نہیں ہمارے آدمیوں کے گھیرے میں ہے اور ان کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس ایسی ہی سٹین گنیں ہیں، پولیس اگر آ بھی گئی تو منٹوں میں اس کا صفایا کر دیا جائے گا ۔ ۔ ۔ ہم نے اس ملک میں ابھی تک ان سٹین گنوں کو استعمال نہیں کیا، لیکن آج ضرورت پڑی تو انہیں استعمال کیا جائے گا۔"

"میں اپنے اس جھوٹ سے یہی معلوم کرنا چاہتا تھا، کہ تمہارے کچھ ساتھی باہر موجود تو نہیں، چنانچہ میں نے نہایت آسانی سے معلوم کر لیا۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"اوہ ۔ ۔ ۔ تم واقعی بہت چالاک ہو۔" ایک نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"شکریہ ۔ ۔ ۔ اب کیا ارادہ ہے۔"

"وہی جو پہلے تھا، تمہاری چالاکی ۔ ۔ ۔ اب تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔"

"چلو دوستو ۔ ۔ ۔ آج تمہاری یہ غلط فہمی بھی دور ہو جائے گی، فائر کر دو۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"گویا تم خوف زدہ نہیں ہو۔" لہجے میں حیرت کا ایک سمندر تھا۔

"میں کہہ چکا ہوں ۔ ۔ ۔ موت جس چیز کا نام ہے، مجھے خوف زدہ نہیں کر سکتی ۔ ۔ ۔ تم فائر کرو، اور میرا کمال دیکھو۔"

"ہم ایسا ضرور کریں گے ۔ ۔ ۔ تمہیں یہ بھی بتا دیں، کہ ان سٹین گنوں کے چلنے سے آواز بالکل پیدا نہیں ہوتی۔" ایک نے کہا۔

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے ۔ ۔ ۔ مجھے خود شور شرابے سے نفرت ہے۔" انہوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

تینوں دشمن ان کی مسکراہٹ پر حیرت زدہ رہ گئے ۔ ۔ ۔ شاید وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی شخص موت کے منہ میں بھی مسکرا سکتا ہے، ساتھ ہی انہیں غصہ آ گیا۔ تینوں نے ایک ساتھ سٹین گنوں سے ان کا نشانہ لیا اور ٹریگر پر ان کی انگلیاں دباؤ ڈالنے لگیں۔

○

تینوں دبے پاؤں چلتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوئے ۔ ۔ ۔ دونوں کمروں کا غسل خانہ مشترک

تھا۔ غسل خانے کا دروازہ کھول کر وہ آگے بڑھے... فاروق نے دوسرے کمرے میں کھلنے والے دروازے کی چٹخنی اس قدر احتیاط سے گرائی کہ ذرا بھی آواز پیدا نہ ہوئی.... ان کے ہاتھوں میں اس وقت کرکٹ کے بلّے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے وہ کرکٹ کھیلنے کے لیے کرکٹ کے میدان کا رُخ کر رہے ہوں، چٹخنی گرانے کے بعد انہوں نے دروازہ نصف انچ سے بھی کم کھولا اور کان بھری سے لگ دیے... پہلے وہ اندر ہونے والی گفتگو سننا چاہتے تھے... وہ سنتے رہے... یہاں تک کہ انہوں نے اپنے والد کو یہ کہتے سنا... تم فائر کرو، اور میرا کمال دیکھو۔ تینوں نے جلدی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا... اب دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔ انہوں نے آواز پیدا کیے بغیر دروازہ پورا کھول دیا.... تینوں دشمنوں کی کمر ان کی طرف تھی، ان کے آگے انسپکٹر جمشید کھڑے تھے، دشمنوں کے قد ان سے بھی کچھ بڑے تھے، اس لیے انسپکٹر جمشید انہیں غسل خانے میں سے نکل کر کمرے تک داخل ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔

اچانک انہوں نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے والد کو اُچھلتے دیکھا... انہیں یوں لگا جیسے اوپر اُچھلنے کے لیے انہوں نے پیروں کے نیچے لگے سپرنگوں سے مدد لی ہو... ادھر وہ اُچھلے، اُدھر سٹین گنوں سے ہزاروں کی تعداد میں ننھی ننھی گولیاں نکل کر دیواروں سے ٹکرائیں، ٹکرانے سے ایسی آواز پیدا ہوئی جیسے بوندیں گرنے لگی ہوں۔ دوسری طرف انسپکٹر جمشید... زمین پر اس وقت واپس گرے جب گولیاں دیواروں سے ٹکرا کر گر چکی تھیں۔

تینوں غیر ملکیوں کا وہ عالم تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں... ان کی آنکھیں حیرت کے مارے کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں... ادھر محمود، فاروق اور فرزانہ کا بھی بُرا حال تھا، انہوں نے اپنے والد کو اتنا اُونچا اُچھلتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُچھلنے کے دوران وہ ان تینوں کو دیکھ چکے تھے، لیکن انہوں نے اپنے چہرے سے یہ بات ظاہر نہ ہونے دی... اور اب وہ دشمنوں کو ایک بار پھر فائر کرنے کی دعوت دے رہے تھے... لیکن انہیں دوسرا فائر کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔ اس دوران محمود، فاروق اور فرزانہ ان کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ تینوں کے ہاتھ ایک ساتھ اوپر اُٹھے اور انہوں نے بلّے ان کے سروں پر پوری قوت سے دے مارے۔

دوسرا لمحہ انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق اور فرزانہ کو حیرت میں ڈال دینے کے لیے کافی تھا۔ بلے کھا کر ان کے سر پھٹے نہیں تھے، نہ ہی وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہونے تھے بلکہ وہ تیزی سے پلٹ پڑے تھے۔ ۔ ۔ بلّے ان کے سروں پر اس طرح ٹکرانے تھے جیسے لوہے کی چیزوں سے ٹکرانے ہوں اور ان کا بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔ پلٹتے ہی انہوں نے اپنے سامنے تین بچوں کو دیکھا، ان کی آنکھوں میں حیرت کے چراغ جل اٹھے۔ ۔ ۔ ان کی حیرت سے فائدہ اٹھا کر تینوں نے ایک بار پھر بلّے ان پر دے مارے، لیکن ان کا کچھ نہ بگڑا۔ ۔ ۔ دوسری طرف انہوں نے سٹین گنوں کے رُخ ان کی طرف کر دیے، لیکن محمود، فاروق اور فرزانہ نے بلّوں کو لاٹھیوں کی طرح سنبھال لیا اور بلّوں کو سٹین گنوں پر دے مارا۔ یہ وار کارگر ثابت ہوا، ان کے ہاتھوں سے سٹین گنیں نکل گئیں۔ ۔ ۔ یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید نے فرش پر ایک لوٹ لگائی اور تینوں سٹین گنوں کو سمیٹتے ہوئے دور نکل گئے، پھر اٹھ کر ایک سٹین گن کا رُخ ان کی طرف کرتے ہوئے بولے:

"ہاتھ اوپر اٹھا دو دوستو۔"

"بے وقوف! یہ ہماری سٹین گنیں ہیں، ہم پر اثر نہیں کریں گی۔" ایک نے غرا کر کہا۔

"اوہو۔ ۔ ۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ تمہیں پہچانتی ہیں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

اتنی دیر میں محمود، فاروق اور فرزانہ بلّوں کو گھماتے ہوئے ان پر حملہ آور ہو چکے تھے۔ ۔ ۔ ۔ بلّوں کی پروا کیے بغیر تینوں غیر ملکیوں نے ایک ایک قدم آگے بڑھایا اور ان کے ایک ایک مکّا رسید کر دیا۔ ۔ ۔ جیسے مذاق کر رہے ہوں۔

تینوں کو یوں لگا جیسے لوہے کے مکّے ان کے جسموں پر پڑے ہوں۔ ان کے قدم لڑکھڑا گئے۔ ۔ ۔ ۔ لیکن پھر سنبھل گئے۔ اس مرتبہ انہوں نے ان تینوں کے گھٹنوں کا نشانہ لیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ دوسری طرف انسپکٹر جمشید حالات کو بھانپ چکے تھے، وہ جان گئے تھے کہ تینوں غیر ملکی فولاد کے خولوں میں بند تھے۔ انہوں نے جلدی جلدی سٹین گنوں کو اپنے گھٹنوں پر مار کر توڑ ڈالا۔ ۔ ۔ ۔ تاکہ کم از کم وہ سٹین گنوں کی طرف سے تو بے فکر ہو جائیں۔ انہوں نے دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ دشمنوں کے گھٹنوں پر پڑنے والے بلّے بھی بے کار ہو گئے تھے۔ ۔ ۔ ۔ اور اسی وقت محمود،

فاروق اور فرزانہ کے سروں سے ان کے مکّے ٹکرائے، تینوں فرش پر گرتے چلے گئے۔

اب انسپکٹر جمشید ان کے مقابلے پر تنہا تھے... اور تنے کھڑے تھے۔ تینوں وحشیانہ انداز میں ہنستے ہوئے ان کی طرف بڑھے... انسپکٹر جمشید اپنے ذہن کو تیزی سے گردش دے رہے تھے... وہ سوچ رہے تھے کہ اگر ان تینوں نے انہیں دبوچ لیا تو پھر سانس نہیں لینے دیں گے اور ان کے مکّے تینوں کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں گے... ان پر تو صرف ایک ہی حربہ کارگر ثابت ہو سکتا تھا۔

اچانک انہوں نے ایک جھکائی دی... اور دشمنوں کی کمر کی طرف آ گئے، دوسرے ہی لمحے انہوں نے ان میں سے ایک کو کمر پر سے پکڑ کر اٹھا لیا اور ہاتھ بلند کرتے چلے گئے، ساتھ ہی وہ تیزی سے گھومنے لگے، دشمن بھی چکر لگانے لگا اور پھر انہوں نے اسے باقی دو پر پوری قوت سے پھینک دیا۔

تین ہولناک چیخیں کمرے میں گونجیں اور وہ لمبے لمبے لیٹ گئے... انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ان کے جسموں پر سے لوہے کا لباس اتار ڈالا — ان کی

آنکھوں کی پتلیاں دیکھ کر یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ سچ مچ بے ہوش ہو چکے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ محمود، فاروق اور فرزانہ کو ہوش میں لا چکے تھے اور انہوں نے تینوں دشمنوں کو باندھ لیا تھا... پھر چھت پر موجود باقی ساتھیوں کو بھی نیچے بلا لیا گیا۔

"لیکن ابا جان... ہم ان پچاس آدمیوں کا کیا کریں جو باہر موجود ہیں۔" محمود نے پریشان ہو کر کہا۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" وہ بولے۔

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے، فون کر کے پولیس کی بڑی تعداد کو بلا لیتے ہیں۔" فاروق نے کہا۔

"نہیں! ان لوگوں کے پاس سٹین گنیں ہیں، پولیس کے بہت سے جوان مارے جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں، جانی نقصان بالکل نہ ہو اور یہ لوگ گرفتار بھی ہو جائیں۔"

"لیکن یہ کیسے ہو گا۔" فرزانہ نے حیران ہو کر کہا۔

"ترکیب تم بتاؤ... اور مہلت میں تمہیں صرف ایک منٹ کی دیتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"ارے باپ رے... اتنی مختصر مہلت... خیر لیجیے ترکیب میرے ذہن میں آ گئی۔"

یہ کہہ وہ ترکیب بتانے لگی۔ تھوڑی دیر بعد انسپکٹر جمشید کے مکان کا دروازہ اندر سے کھولا گیا۔۔۔ اور ایک غیر ملکی نے باہر سر نکال کر سٹین گن سے سب لوگوں کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔۔۔ وہ اندر داخل ہونے لگے۔۔۔ غیر ملکی انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں آیا۔۔۔ یہاں محمود، فاروق فرزانہ، بیگم جمشید، بیگم شیرازی اور دو اور آدمی بندھے پڑے تھے۔۔۔ کمرے میں ایک غیر ملکی سٹین گن تانے کھڑا تھا۔

"ان سب کو باندھا جا چکا ہے۔۔۔ ہم نے سوچا ہے کہ انہیں یہاں سے ٹرک میں ڈال کر اپنے ساتھ لے جائیں اور ختم کر کے کسی غار میں ڈال دیں۔۔۔ تم لوگ سٹین گنیں ایک جگہ جمع کر کے کسی چادر میں باندھ لو۔۔۔ تاکہ ہم پر کسی کو کوئی شک نہ ہو۔۔۔ بس دو سٹین گنیں ہم اپنے کپڑوں میں چھپا کر رکھ لیں گے۔"

"او کے سر!"

سٹین گنیں ایک جگہ ڈھیر کر دی گئیں۔ پھر انہیں کپڑے میں باندھ دیا گیا۔۔۔ اس کے بعد ایک آواز کمرے میں گونجی۔

"اب تم لوگ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔"

"کیا مطلب؟" خوف زدہ آوازیں ابھریں۔

"مطلب یہ کہ جو دو آدمی بندھے پڑے ہیں۔۔۔ وہ تمہارے غیر ملکی آقا ہیں اور تیسرا ایک اور کمرے میں بندھا پڑا ہے۔۔۔ ہم غیر ملکی نہیں۔۔۔ بلکہ اس ملک کے وفادار ہیں۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید نے اپنا ہیٹ اوپر کر دیا۔ انہوں نے غیر ملکی کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ان کے ساتھ جو شخص غیر ملکی کے لباس میں کھڑا تھا، وہ جمال بابا تھا۔۔۔ اس نے بھی اپنے چہرے سے ہیٹ اتار دیا اور اب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ سب جال میں آ گئے ہیں۔۔۔ عقل سے کام لے کر خون خرابے کے بغیر ان پر قابو پا لیا گیا تھا اور یہ ترکیب فرزانہ نے بتائی تھی۔

اس کے بعد پولیس اور بڑے بڑے آفیسروں کو فون کیا گیا۔ جب سب لوگ آ گئے اور مجرموں کو ٹرک میں بند کر کے جیل بھیج دیا گیا تو جمال بابا سے پوچھا گیا۔

"وہ کیا گفتگو تھی جو تم نے سنی تھی۔"

"میں پوری بات بتاتا ہوں۔۔۔ مکان کے پہلے مالکان

نے کان فروخت کرنے کے لیے اخبار میں اشتہار دیا تھا۔
دو تین روسی ماہرین نے آکر سائنسی آلات کی مدد
سے کان کا جائزہ لیا اور پانچ کروڑ روپے میں خرید
لی . . . . میں نے جو گفتگو سنی، اس گفتگو میں وہ
غیر ملکی بھی شامل تھے . . . . ان میں سے ایک نے
کہا۔

"کیا تم انگریزی جانتے ہو؟" اچانک ایک آفیسر نے
اس کی بات کاٹ دی۔

"جی ہاں! میں بہت عرصے تک انگریزوں کا گھریلو
ملازم رہا ہوں . . . . اور مجھے بہت اچھی انگریزی آتی
ہے، آپ چاہیں تو میں ان کے الفاظ انگریزی میں بھی
دہرا سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، انگریزی میں ہی بتاؤ۔"

"اس غیر ملکی نے کہا تھا، ہمارے آلات سے یہ بات
ثابت ہو چکی ہے کہ کان میں یورینیم کی بہت بھاری
مقدار موجود ہے . . . . یوں سمجھ لو کہ ٹنوں کے
حساب سے موجود ہے . . . . اب ہمیں یہ سوچنا ہے
کہ اسے اپنے ملک کس طرح بھیجا جائے، کیوں کہ ان
کانوں سے حاصل ہونے والی کوئی بھی معدنیات ملک

سے باہر بھیجنا خلاف قانون ہے . . . . بس میں نے
یہ الفاظ سنے اور واپس جانے کے لیے مڑا اور یہ لوگ
مجھے ختم کرنے کے لیے میرے پیچھے لگ گئے۔" یہ کہہ کر
جمال بابا خاموش ہو گیا۔

"اُف خدا . . . . تو اس کان میں یورینیم موجود ہے؟"
ایک آفیسر نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

"حالات تو یہی بتاتے ہیں۔" دوسرے نے کہا۔

"یورینیم . . . . جس سے ہمارا ملک ایٹمی ملک
بن سکتا ہے . . . . ہم ایٹمی توانائی حاصل کر سکتے
ہیں . . . . اور پھر ہمارا ملک کمزور نہیں رہے گا . . .
آس پاس کے ملک ہمیں دھمکیاں نہیں دے سکیں گے۔"
ایک اور آفیسر کہتا چلا گیا۔

"اور یہ چکر شروع ہوا تھا جمال بابا کی جان بچانے
کے سلسلے میں . . . . اس وقت ہم سوچ بھی نہیں سکتے
تھے کہ یہ اتنا بڑا معاملہ ثابت ہو سکتا ہے۔" محمود
نے کہا۔

"ہماری یہ مصیبت تو شروع سے ہمارے ساتھ چلی
آ رہی ہے . . . . ہم معمولی سے معمولی معاملے میں

بھی ہاتھ ڈالیں . . . . وہ بعد میں بہت بڑا ثابت ہوتا ہے اور ہم حیران رہ جاتے ہیں . . . . جیسے اس وقت ہیں ۔"

یہ کہہ کر فاروق نے اپنے چہرے پر حیرت طاری کر لی اور وہ سب مسکرانے لگے۔

دوسرے دن کے اخبارات اس واقعے کی تفصیل سے بھرے پڑے تھے . . . . اور انہیں مبارک باد دینے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا تھا' ان میں اخباری رپورٹر بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔

دوپہر کے بارہ بجے فاروق نے تنگ آ کر ایک اخباری رپورٹر سے یہ تک کہہ دیا کہ اگر مبارک باد دینے والوں کے آنے کا سلسلہ اسی زور شور سے جاری رہا تو ہم بہت جلد انَّ ﷲ ہو جائیں گے۔ اخباری رپورٹر ہنسا تھا اور اس نے دوسرے دن کے اخبار میں فاروق کا یہ خیال بھی شائع کر دیا تھا' جسے پڑھ کر لوگ مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

کان پر سرکاری قبضہ کر لیا گیا، ماہرین کی پوری جماعت وہاں مصروفِ عمل ہو گئی اور ایک دن اخبار

میں خبر شائع ہوئی ۔ کان سے یورینیم نکل آیا۔

اس روز پورے ملک میں جشن منایا گیا اور عام تعطیل ہوئی، چھٹی کی، صبح فاروق نے کہا۔

"میں خوف زدہ ہوں، یہ چھٹی بھی کسی کیس کی نذر نہ ہو جائے۔"